

آن لائن ایڈیشن

# ماہنامہ نکتہ

جلد نمبر 1، شمارہ نمبر 2، جنوری 2016



ایک پیغمبر ”نا اتفاقی“ کے مقابلہ میں قوم کا عارضی ”گمراہی“ میں رہنا پسند کرتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک قوم متفق رہتی ہے اسی وقت تک عمدہ نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ اب ظاہر ہو گیا ہوگا کہ قرآن شریف کا ایک حصہ کا تو مفہوم ہی بدل گیا، ایک حصہ بھلا دیا گیا اور ایک حصے کی تعلیم کو کہانیوں کا درجہ دیا گیا ہے، اس سے مستفید ہونے کی کوشش نہیں کی جاتی، تو پھر کون سی تعجب کی بات ہے کہ اب قرآن مجید سے وہ نتیجے پیدا نہیں ہوتے جو ہونے چاہیے اور جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں پیدا ہو چکے ہیں۔

# ماہنامہ نکتہ

جلد نمبر 1، شمارہ نمبر 2، جنوری 2016



سید عبدالوہاب	(مدیر اعلیٰ)	مجلس مشاورت
جاوید اقبال	(مدیر)	(حافظ انیس الرحمن، عبید اللہ شاہ، عارف شیرازی)
احسان رانا	(مدیر)	

## فہرست

2	اداریہ
5	سید عبدالوہاب شیرازی
13	نویدا احمد
15	سید عبدالوہاب شیرازی
18	سید عبدالوہاب شیرازی
21	ڈاکٹر ساجد خاکوانی
26	سید عبدالوہاب شیرازی
32	جلیل احمد
34	صابر عدنانی
38	افسر امان
	باہمی اختلافات، ہماری سوچ اور پیغمبرانہ سوچ میں فرق
	میاں محمد بخش رحمہ اللہ
	تو ہم پرستی
	لگن کی ایجاد
	یوم قائد اعظم
	کیا عوام کو ترجمہ قرآن پڑھنا نا جائز ہے؟
	سسی مولیٰ سے مہنگے امراض کا علاج
	معاشرے میں بڑھتا ہوا عدم برداشت
	باجوڑ مدرسے کے بچو تم بھی ہمیں یاد ہو

## اداریہ

# ربیع الاول کا پیغام

ربیع الاول کے حوالے سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں، ایک یہ کہ ہم تذکرہ رسول کیوں کرتے ہیں؟ دوسرا سوال یہ کہ اللہ کیا چاہتا ہے کہ ہم تذکرہ رسول کیوں کریں؟۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ:

۱۔ ہم تذکرہ رسول اس لئے کرتے ہیں تاکہ ہماری نسبت واضح ہو جائے، ہماری پوزیشن سامنے آ جائے کہ ہم کس کمپ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ دنیا میں طرح طرح کے کمپ لگے ہوئے ہیں، طرح طرح کی دعوتیں، مذاہب اور ادیان ہیں۔ ہر مذہب و ملت اور دین میں کچھ نہ کچھ لوگ ہیں، لہذا ہم تذکرہ رسول کر کے اپنی پوزیشن واضح کرتے ہیں کہ ہم اس کمپ میں بیٹھے ہوئے ہیں، ہماری نسبت اس رسول سے ہے۔ ہمارا تعلق اور بنیاد یہ رسول ہے۔

۲۔ ہم تذکرہ رسول اس لئے بھی کرتے ہیں تاکہ محبت کا اظہار ہو سکے، دل میں جس کی محبت ہوتی ہے لامحالہ اس کا نام زبان پر بھی آتا ہے۔ زبان پر نام کا آنا بھی محبت کی علامت ہے۔ چنانچہ ہم محبت رسول میں اس کی نعتیں پڑھتے اور سنتے ہیں، درود شریف پڑھتے ہیں، نعرے لگاتے ہیں، اور تذکرہ رسول کی محفلیں اور سیرت کے جلسے منعقد کر کے محبت کا اظہار بھی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بتاتے ہیں۔

۳۔ ہم تذکرہ رسول اس لئے بھی کرتے ہیں تاکہ برکتوں کا حصول اور رحمتوں کا نزول ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا جو ایک بار درود شریف پڑھے دس رحمتیں نازل ہوتی ہیں، چنانچہ بار بار تذکرہ کر کے ہم بار بار رحمتیں اور برکتیں سمیٹتے ہیں۔ اگر تذکرہ رسول سے رحمتیں اور برکتیں نہیں حاصل ہوتیں تو پھر کب ہوتی ہیں؟۔

۴۔ ہم تذکرہ رسول اس لئے بھی کرتے ہیں کہ ثواب کا حصول ہو، بلاشبہ تذکرہ رسول باعث حصول ثواب اور ذریعہ نجات بھی ہے۔ مغربی اقوام ہمیں رسول کے معاملے میں تشدد دیکھتی ہیں کہ ان کے اندر برداشت نہیں، بات دراصل یہ ہے کہ قرآن اور رسول کی توہین برداشت کرنا نہ کرنا ان کے ہاں قابل بحث ہو سکتا ہے ہم سے تو قرآن یا

رسول کی توہین برداشت ہوتی ہی نہیں۔ ایک چیز جب برداشت ہوتی ہی نہیں تو کیسے برداشت کریں؟ اس میں کرنا نہ کرنا والی بات کی گنجائش ہی نہیں۔

۵۔ ہم تذکرہ رسول اس لئے بھی کرتے ہیں کہ اللہ راضی ہو جائے۔ رسول اللہ کا محبوب اور حبیب ہے، اگر کوئی میرے دوست یا بھائی کی تعریف کرے تو مجھے خوشی ہوگی، اسی طرح اللہ کے حبیب کی تعریف کرنے سے اللہ بہت خوش ہوتا ہے۔

یہ پہلے سوال کے جوابات تھے اب آتے ہیں دوسرے سوال کی طرف کہ اللہ کیا چاہتا ہے کہ میرے حبیب کا تذکرہ کیوں کیا جائے؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب 21) تمہارے لئے رسول کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ اس نمونے کو اپنی زندگیوں میں لاؤ، رسول کی زندگی آئینہ ہے، جیسے کوئی شخص آئینے کو اس لئے نہیں دیکھتا کہ وہ آئینے کو دیکھنا چاہتا ہے بلکہ اس میں اپنا چہرہ دیکھتا ہے۔ اسی طرح رسول کی زندگی ہمارے لئے آئینہ ہے اس میں ہم اپنا چہرہ دیکھ کر اسے ٹھیک کریں، جہاں کمی ہے اسے پوری کریں۔ رسول کس لئے بھیجا گیا؟ و ما ارسلنا من الرسول الا ليطاع باذن اللہ (ساء 64) ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اسی لئے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ اس لئے اللہ کہتا ہے کہ صبح سے شام تک شام سے صبح تک، بلوغت سے وفات تک رسول کا تذکرہ کرتے جاؤ اور اس نمونے میں ڈھلتے جاؤ، اس آئینے میں ہر روز اپنا چہرہ دیکھو اور اپنی زندگی ٹھیک کرو۔ کیونکہ کل قیامت والے دن اللہ کے ساتھ ساتھ اس رسول کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ چنانچہ اسی بات کو علامہ اقبال نے کیا خوب کہا:

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر  
روزِ محشر عذرہائے من پذیر  
یا اگر بنی حسابم ناگزیر  
از نگاہِ مصطفیٰ پنہا بگیر۔

ترجمہ: اے اللہ تو دو جہانوں کا بادشاہ ہے اور میں فقیر ہوں، قیامت کے دن میرے گناہوں کو معاف ہی کر دینا، اگر حساب ہی لینا ضروری ہو تو، مصطفیٰ کی نظروں سے چھپا کر لینا (تاکہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے)۔

قرآن کہتا ہے پوزیشن بھی واضح کرو، محبت کا اظہار بھی کرو، ثواب بھی کماد لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا نمونہ بھی بنو۔ رسول کی زندگی کا رُخ اور ساری محنت جس دین کے غلبے کے لئے ہوتی رہی اس محنت کو کر کے دین کو تمام ادیان پر غالب کرنے کی کوشش بھی کرو۔

آج ہمارے اقتصادی ماہرین ہمیں بتا رہے ہیں کہ بیرون ممالک سے لئے گئے قرضوں نے ہمارا بیڑا غرق کر دیا ہے اور ادھار کھا کھا کر اور اپنے حکمرانوں کے اللے تلے کے سبب ”خود کفالت“ اور ”خود کفایت“ سے ہم بے حد دور ہیں۔ اقتصادی ماہرین اتنا ہی بتا سکتے ہیں اگرچہ سچ بتاتے ہیں۔ مگر ہمارے سماجیات کے وہ ماہرین کہاں ہیں جو ہمیں بتائیں کہ اس قوم نے صرف قرضوں کا ادھار نہیں کھایا اس کا سب معاملہ ادھار پر ہے۔ افکار، نظریات، طرز ہائے معاشرت، تہذیبی اقدار، برتری اور کمتری کے معیار، نظام ہائے حکومت، بنیاد ہائے ریاست غرض کون سی چیز اس کی اپنی ہے؟ کوئی چیز اس نے اللہ اور رسول سے لی ہے؟ کون ہے جو اسے بتائے کہ یہ سب کچھ خدا سے لینا ہے اور یہ کہ اللہ نے جو ایک رسول بھیجا ہے وہ خاص اسی مقصد کے لئے ہی بھیجا ہے نہ کہ محض اس کی نعمتیں پڑھی جانے کے لئے، اور یہ کہ ان سب معاملات میں ہدایت رسول کے سوا کہیں اور سے لینا اسلام سے براہ راست تصادم ہے اور اللہ کے ساتھ کھلا کھلا شرک؟ سورہ نساء میں فرمایا: نہیں (اے نبی) تیرے رب کی قسم یہ ہرگز مومن نہیں جب تک کہ یہ تجھے اپنے سب اختلافات میں فیصل نہ مان لیں پھر اس پر اپنے نفس میں حرج تک محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم نہ ہو جائیں۔



(نکتہ: سید عبدالوہاب شیرازی)

## باہمی اختلافات، ہماری سوچ اور پیغمبرانہ سوچ میں فرق

مولوی انیس احمد ایک گمنان مجاہد، تحریک ریشی رومال کے سرگرم کارکن اور اسیر مالنا تھے۔ 1912ء میں علیگڑھ سے گریجویشن کرنے کے بعد انگریز کی عطا کردہ ”ڈپٹی کلکٹری“ یعنی جج کا عہدہ چھوڑ کر علوم قرآنی حاصل کرنے کے لئے دہلی پہنچے۔ دہلی میں قائم مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ کے ادارے ”ادارہ نظارۃ المعارف“ میں داخلہ لیا، کافی عرصہ علوم قرآنی کی تحصیل کرتے رہے اور پھر سید فراغت لے کر دیوبند میں شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کے حلقہ درس میں داخل ہو گئے۔ دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ سے تبلیغ قرآن اور علوم دین کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ ہی کے زیر سایہ تحریک ریشی رومال میں سرگرم ہو گئے، تحریک میں حیدر آباد کن کے ذمہ دار رہے۔ بعد ازاں بغاوت کے جرم میں انگریز کے ہاتھوں گرفتار ہو کر کالا پانی میں قید رہے اور پھر چند سالوں کے بعد وہاں سے رہائی ہوئی۔ ان کی علمی وجاہت کی یہ شان تھی کہ خواجہ حسن نظامی جیسے لوگ ان سے عاجزانہ ملتے تھے، علامہ مشرقی، علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، سر عبدالقادر سمیت بڑے بڑے لیڈران سے مشورے لیا کرتے اور اس کو اپنا اعزاز سمجھتے تھے۔ رہائی کے بعد بھی انگریزان کو بہت تنگ کرتے رہے، ان کے بیٹے شاہد احمد کو مقابلے کے امتحانوں میں نہیں بیٹھنے دیا جاتا تھا۔

مولوی انیس احمد کا مختصر تعارف کروانے کا مقصد یہ ہے کہ ان کی ایک کتاب ”انوار القرآن“ آج کل میرے زیر مطالعہ ہے، میری علماء سے گزارش ہے کہ وہ مولوی انیس احمدؒ کی یہ کتاب اور مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کی کتاب ”وحدت امت“ کو ضرور مطالعہ کریں۔ مولوی انیس احمدؒ ”انوار القرآن“ میں لکھتے ہیں: ایک پیغمبر ”نا اتفاقی“ کے مقابلہ میں قوم کا عارضی ”گمراہی“ میں رہنا پسند کرتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک قوم متفق رہتی ہے اسی وقت تک عمدہ نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ اب ظاہر ہو گیا ہوگا کہ قرآن شریف کا ایک حصہ کا تو مفہوم ہی بدل گیا، ایک حصہ بھلا دیا گیا اور ایک حصے کی تعلیم کو کہا نیوں کا درجہ دیا گیا ہے، اس سے مستفید ہونے کی کوشش نہیں کی جاتی، تو پھر کون سی تعجب کی بات ہے کہ اب

قرآن مجید سے وہ نتیجے پیدا نہیں ہوتے جو ہونے چاہیے اور جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں پیدا ہو چکے ہیں۔

مولوی انیس احمدؒ کی یہ بات کہ پیغمبر انا سوچ کیسی ہوتی ہے ہمیں بلاشبہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے، ہماری سوچ آج کیسی بن گئی ہے، معمولی اور فردی اختلافات میں پڑھ کر ہم نے قوم کو کئی حصوں میں تقسیم بھی کیا ہوا ہے اور پھر اس بات کا رونا بھی روتے ہیں کہ اسلام غالب نہیں ہو رہا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر تشریف لے گئے تو قوم نے ہچھڑے کی پوجا شروع کر دی، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس تشریف لائے تو اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام سے فرمایا: اے ہارون جب تم نے ان کو دیکھا تھا کہ یہ لوگ گمراہ ہو گئے تو تم کو کیا وجہ مانع ہوئی کہ تم نے میری ہدایت کی پیروی نہ کی۔ کیا تم نے میری حکم عدولی کی؟ (طہ ۹۳) یعنی جب وہ گمراہ ہو رہے تھے تو تم نے ان کو منع کیوں نہ کیا، تو حضرت ہارون علیہ السلام نے فرمایا: اے میری ماں کے بیٹے میری داڑھی اور سر کے بال نہ پکڑو، میں اس بات سے ڈرا کہ تم واپس آ کر یہ کہنے لگو کہ تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی (طہ) یعنی حضرت ہارون علیہ السلام کو جب اپنی اصلاح کی کوششوں میں کامیابی نہ ہوئی تو انہوں نے اپنی قوم کی عارضی گمراہی کو پسند کیا بجائے اس کے کہ آپ اس کو روکنے کے لئے ایسی پرزور کوشش کرتے جس سے قوم کے ککڑے ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ حضرت موسیٰ کی قوم کا واقعہ اور شرک میں مبتلا ہونا محض شک والی بات نہیں تھی بلکہ واضح طور پر انہوں نے شرک کیا تھا، اب اگر ہم اپنے ارد گرد کو دیکھیں، یا ہم اپنے گریبان میں جھانکیں کہ ہمارا کیا حال ہے؟ ہم تو محض شک اور گمان کی بنیاد پر بلا دلیل کفر و شرک کے فتوے ٹھوک دیتے ہیں، اور کسی کو کافر بنانے یا گمراہ قرار دینے کا معیار ہم نے اپنا مسلک یا اپنا مدرسہ بنا دیا ہے جو ہمارے مسلک میں ہے یا ہمارے مسلک کے مدرسے میں پڑھا ہے اس کے ہدایت یافتہ ہونے کے لئے اتنی بات کافی ہے اور جو ایسا نہیں وہ گمراہ ہے۔

مفتی مختار الدین شاہ مدظلہ فرماتے ہیں: محض شک اور گمان کی بنیاد پر نہ تو کسی پر الزام لگانا چاہیے اور نہ ہی کفر و شرک کے فتوے، ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ”الزام“ اور ”التزام“ میں فرق ہوتا ہے، فتویٰ ”لازم“ پر نہیں بلکہ ”التزام“ پر لگتا ہے۔ بولنے والے یا لکھنے والے کی بات اور تحریر سے جو مفہوم نکلتا ہے اس کو ”لازم“ کہتے ہیں، اور معنی کا اگر صاحب تحریر اقرار اور اعتراف کرے یا اس کے کلام کا مکمل سیاق و سباق کوئی معنی متعین کرتا ہے تو اسے معنی التزامی کہتے ہیں، لہذا اگر صاحب تحریر کے معنی لازمی اور معنی التزامی میں فرق ہو تو معنی التزامی پر حکم یا فتویٰ لگایا جائے

گانہ کہ معنی لازمی پر۔ چنانچہ صرف مفہوم لازمی کو دیکھتے ہوئے فتویٰ یا حکم لگایا تو یہ اس شخص پر محض الزام، غلط اور شریعت کی حدود سے تجاوز اور ظلم ہوگا۔ آج کل کی بہت بڑی خرابی یہ ہے کہ متکلم اور تحریر کنندہ جیج جیج کر پکارتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ میرا مطلب وہ نہیں جو آپ میرے عمل یا تحریر سے نکالتے ہیں لیکن ہم اس کی بات کو سننے کو تیار نہیں ہوتے بلکہ اس کے قول و فعل کو وہ غلط معنی پہناتے ہیں جس کا خود متکلم انکار کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس طرح کا ایک واقعہ رونما ہوا جسے صحیح مسلم میں نقل کیا گیا ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انصار میں ایک آدمی تھا جو مسجد نبوی سے زیادہ دور رہتا تھا اور اس کا حال یہ تھا کہ وہ ہر نماز مسجد نبوی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھتا تھا۔ میں نے ایک دن اس سے کہا کہ بہتر ہوگا کہ تم اندھیری راتوں میں مسجد تک سواری کے لئے ایک گدھا خرید لو، تو وہ کہنے لگا ”مجھے تو یہ بات پسند نہیں کہ میرا گھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں ہو“ حضرت ابی بن کعب کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات بہت بُری معلوم ہوئی، میں نے اس بات کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، تو اس شخص کو بلایا گیا اور وضاحت طلب کی گئی تو اس نے وہی کچھ عرض کیا جو پہلے کہا تھا اور ساتھ یہ وضاحت بھی کی کہ میں نے ایسا اس لئے کہا کہ مجھے قدموں کا ثواب مل جائے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں وہی ثواب ملے گا جس کی تم نے نیت کی ہے۔ (مسلم) اب بظاہر اس کی بات کا غلط مفہوم لگتا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قربت نہیں چاہتا، لیکن اس نے اس کی وضاحت کر دی کہ میں پانچ وقت روزانہ پیدل چل کر اتنی دور سے آتا ہوں اس کا مجھے ثواب ملتا ہے۔ (راہ محبت)

اس طرح کے اختلافی مسائل میں شیطان مسلمانوں کو افراط و تفریط میں مبتلا کر دیتا ہے، ہر مکتبہ فکر میں اس طرح کے لوگ موجود ہیں جو بلا تحقیق غلط پروپیگنڈا کر کے اختلافات کو پھیلاتے اور تفرقہ بازی کے مرتکب ہو کر قرآنی حکم سے روگردانی کر رہے ہیں۔ خاص طور پر علماء کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ بلا وجہ اور بغیر تحقیق کے کسی کی نیت پر حملہ دار ہونے کے بجائے حسن ظن رکھیں تا آنکہ کھلم کھلا جوت نہ مل جائے۔ علماء کو عام اجتماعات یا عام بیانات میں اختلافی مسائل کی تبلیغ یا تردید نہیں کرنی چاہیے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر صرف اور صرف متفقہ معارفات اور متفقہ منکرات میں ہوتا ہے، اختلافی مسائل تو ترجیحی مسائل ہیں، ان میں جو نظریہ اور رویہ جس کے نزدیک رائج ہے وہ اس کو اختیار کر لیتا ہے۔

سورہ انفال میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑنا نہ

کر دو رنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور صبر کرو اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (46) اتحاد و اتفاق کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ صبر ہے، کیونکہ جب بھی بہت سے لوگ ایک ساتھ رہیں گے تو ان کے درمیان طرح طرح کی شکایتیں پیدا ہوں گی، ایک دوسرے سے تکلیف پہنچے گی، کبھی کسی کی تنقید پر غصہ آئے گا، کبھی کسی کی ترقی پر۔ اختلاف کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے سے اتحاد وجود میں آتا ہے۔ سورہ انعام میں فرمایا: اے مسلمانو خدا سے ڈرو، سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو، اور اس میں متفرق نہ ہو، آپس میں اختلاف کرنا آگ کے کنارے کھڑا ہونا ہے، خدا کے نزدیک وہی لوگ کامیاب ہیں جو خصوصی اہتمام کے ذریعہ ہر حال میں اپنے اندر اتحاد و اتفاق کی فضا کو باقی رکھتے ہیں، اس سے پہلے خداوندی علم کی امانت یہود کو دی گئی تھی مگر وہ تقریق اور اختلاف میں پڑ گئے اور اس کے نتیجہ میں اپنے کو عذاب عظیم کا مستحق بنالیا۔ ان کے انجام سے ڈرو اور تم بھی انہیں کی طرح نہ جاؤ (102)

اختلاف کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اختلاف کی کوئی صورت پیدا نہ ہو، انسانوں کے درمیان اختلاف کا پیدا ہونا بالکل فطری ہے مگر جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہوں وہ معاملہ کی وضاحت کے بعد یا تو اپنے اختلاف کو ختم کر دیتے ہیں اور اگر پھر بھی اختلاف باقی ہو تو وہ اس کو اپنے ذہن تک محدود رکھتے ہیں، عملی زندگی میں اس اختلاف کو پھیلا کر معاشرے کو خراب نہیں کرتے۔

مولانا زاہد الراشدی مدظلہ فرماتے ہیں: ہمارے ہاں بدقسمتی سے یہ مزاج راسخ ہوتا جا رہا ہے کہ ہم نے جس کے خلاف کچھ کہنا ہوتا ہے، اس کا موقف اس سے نہیں پوچھتے بلکہ اس کی چند عبارات کو سامنے رکھ کر خود طے کرتے ہیں اور اگر وہ جواب میں اپنے موقف کی وضاحت کرے تو اسے یہ حق دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ماضی میں یہ طرز عمل مولانا۔۔۔۔۔۔ نے اختیار کیا تھا کہ علماء کی کتابوں سے اپنے مطلب کی چند عبارات منتخب کر کے ان سے اپنی مرضی کے نتائج اخذ کیے تھے اور ان پر ایک استغنا کی بنیاد رکھ کر حرمین کے علماء کرام سے فتویٰ حاصل کیا۔ ہمارے ہاں یہ مزاج بن گیا ہے کہ ہر اختلاف کو کفر و اسلام کا معرکہ بنالیا جاتا ہے، ہر جھگڑے کو 302 کا کیس بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے چند واقعات نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ایک معروف و مشہور اہل بدعت عالم جو اکابر دیوبند کی تکفیر کرتے تھے اور ان کے خلاف بہت سے رسائل میں نہایت سخت الفاظ

کیونکہ ان کی نیت ان سب چیزوں سے ممکن ہے کہ تعظیم رسول ہی کی ہو۔ (مجالس حکیم الامت) ایک مرتبہ ان کی مجلس میں کسی نے کہا فلاں پیر صاحب بازاری عورتوں کو بھی مرید کر لیتے ہیں تو حضرت نانوتوی نے فوراً خاموش کراتے ہوئے کہا، تم نے ان کی راتوں کو جاگ کر اللہ کے سامنے گریہ زاری نہیں دیکھی؟۔ اسی طرح ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے سرسید احمد خان کے خلاف ایک فتویٰ آپ کو دستخط کرنے کے لئے پیش کیا، آپ نے کہا پہلے تحقیقات تو کر لو آیا وہ کافر ہے بھی یا نہیں؟ چنانچہ خود ہی سرسید احمد خان کی طرف تین سوال لکھے: ۱۔ خدا پر آپ کا عقیدہ کیا ہے؟ ۲۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کا عقیدہ کیا ہے؟ ۳۔ قیامت کے متعلق آپ کا عقیدہ کیا ہے؟ سرسید احمد خان نے جواب میں لکھا: ۱۔ خدا تعالیٰ مالک ازلی اور صانع تمام کائنات ہے، ۲۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر، ۳۔ قیامت برحق ہے۔ تو پھر حضرت نانوتوی نے فرمایا تم اس شخص کے خلاف دستخط کروانا چاہتے ہو جو کچا مسلمان ہے؟۔

حضرت کے اس فیصلے کو آج کے مفتی شاید تسلیم ہی نہ کریں، لیکن حضرت کا اعتقاد اور مقام انہیں خاموش رکھنے کے لئے کافی ہے۔ بد قسمتی سے ایک طرف کوئی اعلیٰ علمی اور قابل شخصیت ہوتی ہے لیکن اس کی باتوں کو اس لئے قابل اعتماد نہیں سمجھا جاتا کہ ہمارے علم میں یہ نہیں کہ اس کے اساتذہ کون ہیں، یا اگر ہیں تو وہ ہمارے خیال میں مستند نہیں ہیں۔ میں نے دو تین سال قبل ایسا ہی ایک استفتاء کسی معروف شخصیت جواب اس دنیا میں نہیں ان کے بارے میں لکھا، میرا سوال یہ تھا کہ ان کی دو چار موٹی موٹی گمراہیاں بتا دیں کیونکہ لاکھوں لوگ ان کی کتابیں پڑھتے اور ویڈیوز سنتے ہیں، یہ استفتاء دارالعلوم کراچی سمیت کئی بڑے بڑے جامعات کو بھیجا گیا۔ سوائے دارالعلوم کراچی کے کسی نے اس کا جواب دینا ہی نہیں دیا، اور دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء سے جو جواب آیا وہ مفتی تقی عثمانی و مفتی رفیع عثمانی مدظلہم کا لکھا ہوا نہیں تھا بلکہ شاید ان کے علم میں بھی نہ ہو، بہر حال کسی مفتی صاحب نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے جواب میں محض اتنا لکھا کہ یہ شخص مستند اساتذہ اور مشائخ سے نہیں پڑھا ہوا لہذا اس کی کتابیں اور ویڈیوز نہیں دیکھنی چاہیے۔ یعنی سوال گندم، جواب جو۔ اس جواب سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ جواب دینے والا مفتی محض سنی سنائی بات پر جواب دے رہا ہے۔ آج فتویٰ دینے کا یہی معیار رہ گیا ہے کہ نہ تحقیق کرنی ہے اور نہ اس کے بارے میں معلومات لیتی ہیں۔ پچھلے پندرہ بیس سالوں سے مدارس میں یہ دباء پھوٹ پڑی ہے کہ ایک ایک سال کے مفتی کو رس کروا کر سندیں بانٹی جا رہی ہیں چنانچہ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج کے مفتی یا لکیر کے فقیر ہیں یا سنی سنائی باتوں پر بغیر تحقیق کے

فتوے جھاڑتے ہیں، فیصلہ کرنے کی صلاحیت اور قابلیت کیا چیز ہوتی ہے اس بارے میں انگریز جج کا واقعہ ملاحظہ کریں جو نہ دین اسلام سے واقف ہے اور نہ ہی قرآن وحدیث اور اسلامی قانون سے، سابقہ مہتمم دارالعلوم دیوبند قاری محمد طیب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ایک مرتبہ اہل حدیث اور حنفیوں کے درمیان ”آمین“ پر لڑائی ہوگئی، خوب مار کٹائی بھی ہوئی، بالاخر اس کا کیس انگریز جج کے پاس گیا تو اس نے کہا یہ ”آمین“ کیا چیز ہے کوئی بلڈنگ ہے یا پراپرٹی ہے؟ لوگوں نے سمجھایا کہ ایک لفظ ہے، ایک فریق کہتا ہے حدیث میں ہے اسے بلند آواز سے بولنا ہے جبکہ دوسرا کہتا ہے حدیث میں ہے آہستہ بولنا ہے۔ تو انگریز جج نے کہا جس کو جو حدیث معلوم ہے وہ اس پر عمل کرے بڑتے کیوں ہو؟ اور پھر اس نے تفصیلی فیصلے میں لکھا: میں ساری تحقیق کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاں ”آمین“ کی تین قسمیں ہیں، ایک آمین بالجہر یعنی اونچی کہنا، دوسری آمین بالسر یعنی آہستہ کہنا، جبکہ تیسری آمین بالشر یعنی لڑنے کے لئے کہنا، لہذا عدالت دونوں فریقوں کو فلاں فلاں سزا سناتی ہے تاکہ آئندہ نہ لڑیں۔ قاری طیب صاحب انگریز جج کے اس فیصلے کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس نے بڑا دانشمندانہ فیصلہ لکھا، یہ تو ہمارے دلوں کا فساد ہے کہ ہم نے مسائل کو اپنے دل کے جذبات نکالنے کی آڑ بنا لیا ہے اور ہر دین کا مسئلہ جھگڑا ڈالنے اور گروہ بندیوں کے لئے رہ گیا ہے (خطابات)۔ جی ہاں مفتی کی حیثیت بھی جج کی سی ہوتی ہے بس فرق یہ ہے کہ جج کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے اور انتظامیہ اس پر عمل درآمد کرداتی ہے، جبکہ مفتی کا کام صرف رہنمائی کرنا اور بتانا ہوتا ہے نافذ وہ نہیں کر سکتا۔ اس انگریز جج نے اس معاملے کو ویسے ہی نہیں ٹال دیا بلکہ اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے مطالعہ کیا، تحقیق کی، لوگوں سے معلومات اکٹھی کیں اور پھر ایسا دانشمندانہ فیصلہ دیا کہ معاشرے میں اختلاف نہ پھیلے بلکہ لوگ متفق ہو کر رہیں اور آپس میں جھگڑا نہ کریں۔

قاری طیب صاحب ملتان میں خیر المدارس میں آئے جلسے سے خطاب کیا اور پھر پوچھا یہاں ملتان میں کوئی اور عالم ہیں؟ بتایا گیا کہ مولانا محمد بخش ہیں لیکن بریلوی فرقے سے تعلق ہے، تو مہتمم دارالعلوم دیوبند قاری طیب نے فرمایا: ہم انہیں فرقہ ہی نہیں سمجھتے، نہ ہم فرقہ نہ وہ فرقہ۔ اور پھر سب کے منع کرنے کے باوجود ان کی مسجد میں گئے اور ملاقات کی۔ اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا: میں ہمیشہ اس کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ بھی منافرت مت پیدا کرو، اپنی رائے ہے، اگر آپ دیا صحیح سمجھتے ہو تو اس پر عمل کرو، لیکن نفرتیں پیدا کرنا صحیح نہیں (خطبات حکیم الاسلام ج ۵ ص ۲۲۲)

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ ”وحدت امت“ میں ایک واقع لکھتے ہیں کہ: ایک مرتبہ صبح نماز فجر کے وقت اندھیرے

مفتی شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میرے نزدیک اس جنگ وجدل کا ایک بہت بڑا سبب فروعی اور اجتہادی مسائل میں تخریب و تعصب اور غلو ہے۔۔۔۔۔ بعض حضرات کا غلو تو یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ اپنے سے مختلف رائے رکھنے والوں کی نماز کو فاسد اور اُن کو تارکِ قرآن سمجھ کر اپنے مخصوص مسلک کی اس طرح دعوت دیتے ہیں جیسے کسی منکر اسلام کو اسلام کی دعوت دی جا رہی ہو۔ معلوم نہیں یہ حضرات اسلام کی بنیادوں پر چاروں طرف سے حملہ آور طوفان سے واقف نہیں؟۔۔۔۔۔ اور اگر محشر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے سوال کر لیا کہ میرے دین اور شریعت پر اس طرح کے حملے ہو رہے تھے تم وراثتِ نبوت کے دعوے دار کہاں تھے؟ تو کیا ہمارا یہ جواب کافی ہو جائے گا کہ ہم نے رفع یدین کے مسئلے پر ایک کتاب لکھی تھی۔۔۔۔۔ ہماری دینی جماعتیں جو تعلیم دین یا ارشاد و تلقین یا دعوت و تبلیغ کے لئے قائم ہیں۔۔۔ اگر یہی متحد ہو کر تقسیم کار کے ذریعہ دین میں پیدا ہونے والے تمام رخنوں کے انسداد کی فکر کرنے لگیں اور اقامتِ دین کے مشترک مقصد کی خاطر ہر جماعت دوسری کو اپنا دست و بازو سمجھ تو یہ مختلف جماعتیں اپنے اپنے نظام میں الگ الگ رہتے ہوئے بھی اسلام کی ایک عظیم الشان طاقت بن سکتی ہیں۔۔۔۔۔ علی غلو ہر جماعت میں یہ پایا جاتا ہے کہ اپنے مجوزہ نظامِ عمل کو مقصدِ منصوص کا درجہ دے دیا گیا جو شخص اس نظامِ عمل میں شریک نہیں اگرچہ اس کا

مقصد کتنا ہی عظیم ہو اس کو اپنا بھائی نہیں سمجھا جاتا، اور اگر کوئی اس نظام عمل میں شریک تھا پھر الگ ہو گیا تو عملاً اسے اصل مقصد سے منحرف سمجھ لیا جاتا ہے اگرچہ وہ اصل مقصد یعنی اقامتِ دین کی خدمت پہلے سے بھی زیادہ کرنے لگے۔ (وحدت امت)

مفتی شفیع رحمہ اللہ کی اس دلسوز تقریر میں ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ ہم اپنے گریبان میں جھانکیں، اپنا محاسبہ کریں کہ ہم کس سمت جا رہے ہیں، کہیں کوئی نادیدہ ہاتھ مخیر حضرات کی شکل میں فنڈ دے کر فرقہ واریت اور باہمی اختلافات کو ہمارے ذریعے سے جاری تو نہیں رکھ رہا، تاکہ دینی طبقہ اسی فضول کام میں لگا رہے اور اقامتِ دین کی جدوجہد کی طرف اس کا دیہان ہی نہ ہو، یاد رکھیں ایسے مخیر حضرات کے پیچھے مقامی ہاتھ بھی ہوتا ہے اور بیرونی بھی۔ ذرا دیہان سے!



تحریر: نوید احمد (جدہ سعودی عرب)  
ایڈیٹر: انجیف جہلم لائیو

## میاں محمد بخش (1830-1907)

سانولے رنگ اور کمزور جسم کے مالک پنجابی زبان کے عظیم صوفی شاعر میاں محمد بخش آزاد کشمیر کے ضلع میرپور کے نواحی علاقہ کھڑی شریف میں مدفون ہیں، جہاں ان کا مزار پرانوار عقیدت مندوں کو دلچسپی سکون پہنچاتا ہے وہیں ان کی شاعری روحانی فکر کے نئے دریچے کھولتی ہے، میاں صاحب کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے اگرچہ مختلف آراء پائی جاتی ہیں تاہم محققین کی اکثریت اس رائے پر متفق ہے کہ میاں محمد بخش 1830ء میں کھڑی شریف سے ملحقہ گاؤں چک ٹھاکرہ میں میاں مٹس الدین کے ہاں پیدا ہوئے، آپ کے آباؤ اجداد ضلع گجرات کے علاقہ چک بہرام سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے، میاں صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، اس کے بعد اپنے بڑے بھائی بہاول بخش کے ہمراہ سوال شریف کی درگاہ حافظ محمد علی کے استاد حافظ ناصر الدین سے قرآن، حدیث، فقہ، منطق اور دیگر دینی علوم کی تعلیم حاصل کی، محققین نے اس بات پر بہت کم توجہ دی کہ میاں صاحب کا زمانہ سیاسی حوالے سے افراتفری کا دور تھا، انگریز برصغیر پاک و ہند پر قابض ہو چکے تھے اور مسلمانوں کی سیاسی و سماجی حالت بہت ابتر تھی، اس دور پر آشوب میں دشوار گزار پہاڑی علاقے کے مکین کی تعلیمات آج بھی اگر رشد و ہدایت کا مرکز ہے تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ میاں صاحب اپنے زمانے سے بہت آگے تھے، میاں صاحب کا عارفانہ کلام مجازی رنگ میں عشق حقیقی کی داستان ہے، آپ کی کم و بیش اٹھارہ تصانیف ہیں جن میں ایک فارسی جبکہ دیگر پنجابی زبان میں ہیں، تاہم جس کتاب نے میاں صاحب کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا وہ کتاب عربی ادب کی مشہور داستان الف لیلیٰ سے ماخوذ سفر عشق ہے جسے دنیا سیف الملوک کے نام سے جانتی ہے، یہ کتاب مصری شہزادہ سیف الملوک اور ایک حسین پری بدیع الجہال کے افسانوی عشق پر لکھی گئی ہے، مولانا روم کی روحانی فکر سے نسبت کی وجہ سے میاں محمد بخش کو رومیء کشمیر بھی کہا جاتا ہے، رومیء کشمیر نے اس کتاب میں عشق حقیقی کے منفرد اسرار و رموز بیان کیے ہیں، سیف الملوک کے اشعار کی

کل تعداد 9249 بتائی جاتی ہے، پنجابی زبان میں لکھی جانے والی یہ کتاب تزکیہء نفس، معرفت و حکمت، حسن اخلاق اور رواداری جیسے موتیوں سے مالا مال ہے، پنجاب کے مختلف علاقوں کے الفاظ و تراکیب اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، اگرچہ دوسرے شعراء نے بھی اس افسانوی قصے پر طبع آزمائی کی ہے لیکن جو مقبولیت میاں محمد بخش کو ملی وہ کسی دوسرے داستان گو شاعر کو نصیب نہیں ہوئی، میاں صاحب نے 33 برس کی عمر میں سیف الملوک لکھی جو آج بھی خطہء پٹھوار سمیت دیگر علاقوں میں سوز و گداز سے پڑھی، سنی اور سنائی جاتی ہے، حمدیہ اور نعتیہ کلام کے علاوہ اس کتاب میں شیخ عبدالقادر جیلانی اور میاں صاحب کے مرشد اور بزرگ پیرے شاہ غازی کا حوالہ جا بجا ملتا ہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تشریح خوبصورت انداز میں کی گئی ہے،

اپنے ایک حمدیہ شعر میں میاں صاحب رقمطراز ہیں۔

اول حمد ثناء الہی جو مالک ہر ہر دا  
اس دا نام چٹارن والا کسے میدان نہیں ہر دا  
انسانی کردار کے بارے میں میاں صاحب کا زبان زد عام شعر ہے کہ  
دنیا تے جو کم نہ آیا اوکھے سوکھے ویلے  
اس بے فیضے سگی کولوں بہتر یار اکیلے  
انسان کی کوشش اور اختیار کے بارے میں میاں محمد بخش فرماتے ہیں کہ  
مالی دا کم پانی دینا تے بھر بھر مشکاں پاوے  
مالک دا کم پھل پھول لانا لاوے یا نہ لاوے

مندرجہ بالا اشعار کلام میاں محمد بخش کے چند نمونے ہیں در نہ سخن شناس کہتے ہیں کہ آپ کا ہر شعر اپنے اندر ایک داستان سموئے ہوئے ہے،

میاں محمد بخش 22 جنوری 1907ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور اپنے جد امجد پیرے شاہ غازی کے مزار کے احاطے میں مدفون ہیں، تاہم ان کی تعلیمات زندہ و جاوید ہیں،

## توہم پرستی

سابق امریکی صدر ریگن ہر وقت اپنی جیب میں ایک چھوٹی سی سونے کی جوتی رکھتے تھے۔ یہ جوتی ان کو صدر بننے سے پانچ سال قبل ان کے ایک دوست نے دی تھی۔ صدر ریگن کو یقین تھا کہ اس سنہری جوتی میں طلسماتی اثرات چھپے ہوئے ہیں۔ وہ ان کو ہر آفت سے بچاتی ہے۔ چنانچہ مارچ 1981 میں جب ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تو ان کے خیال کے مطابق اسی جوتی نے ان کو اس سے محفوظ رکھا تھا۔ یہ بلاشبہ توہم پرستی (Superstition) ہے۔ مگر اس توہم پرستی کا ایک معلوم سبب ہے اور وہ یہ کہ موجودہ دنیا میں انسان کے ساتھ جو واقعات پیش آتے ہیں وہ ایسے پراسرار ہوتے ہیں کہ آدمی پوری طرح ان کی توجیہ نہیں کر پاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ چھپے ہوئے عوامل ہیں جو کسی کو کامیاب اور کسی کو ناکام کر دیتے ہیں۔ کوئی شخص ایک نتیجہ سے دوچار ہوتا ہے اور کوئی شخص دوسرے نتیجہ سے۔ اور دونوں میں سے کوئی بھی حقیقی معنوں میں نہیں بتا سکتا کہ اس کے ساتھ جو ہوا وہ کیوں ہوا۔ ایک بار ایک بڑے تاجر سے پوچھا گیا کہ تجارت میں کامیابی کا راز کیا ہے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر کہا ”قسمت“۔

دراصل یہ پراسراریت اس لئے ہے کہ یہ سب کچھ کرنے والا اللہ ہے، مگر انسان چوں کہ نبی اللہ کو دیکھ نہیں پاتا اس لئے وہ کسی نہ کسی دکھائی دینے والی چیز کو اپنا خدا بنا لیتا ہے خواہ وہ سونے کی جوتی یا پتھر کی انگلی ہی کیوں نہ ہو۔ انسان مجبور ہے کہ وہ کسی کو اپنا خدا بنائے۔ اللہ کو بنائے یا اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو بنالے۔

توہم پرستی کسے کہتے ہیں؟ توہم پرستی کی تعریف یوں کی جاتی ہے: ایک تصور یا کچھ لوگوں کا خیال کہ جو واقعات رونما ہوتے ہیں انکے پیچھے کوئی پوشیدہ طاقت ہوتی ہے یا کچھ لوگ ایسی باتوں پر یقین رکھتے ہیں جسکی صحت کے بارے میں وہ خود بھی نہیں جانتے یا انکے حقیقی ہونے کے اسباب سے ناواقف ہیں اور انکی حقیقت کو سائنٹفک طریقہ سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ توہم پرستی کے لیے ایک لفظ ضعیف الاعتقادی بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ توہم پرست یا ضعیف الاعتقاد افراد اپنے صحیح اور غلط افعال کا ذمہ دار اسی پوشیدہ طاقت کو ٹھہراتے ہیں۔ یہ رجحان انفرادی طور پر نقصان دہ ہے کیونکہ ایسے افراد حقیقت سے دور رہتے ہیں اور غیر فطری خیالات کے جنجال میں پھنس جاتے ہیں۔

طلوع اسلام کے وقت دنیا کی تمام اقوام کے عقائد میں کم و بیش خرافات اور جن و پری وغیرہ کے قصے شامل تھے۔ اس زمانے میں ایسی ڈوریوں کو جنہیں کمانوں کی زہ بنانے کے کام میں لایا جاتا تھا لوگ اونٹوں اور گھوڑوں کی گردنوں نیز سروں پر لٹکا دیا کرتے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ایسے ٹوکلوں سے ان کے جانور بھوت پریت کے اثر سے بچ رہتے ہیں۔ اور انہیں کسی کی بری نظر بھی نہیں لگتی۔ اسی طرح جب دشمن حملہ کرنے کے بعد لوٹ مار کرتا ہے تو ایسے ٹوکلوں کی وجہ سے ان جانوروں پر ذرا بھی آنچ نہیں آتی۔

چوتھی صدی میں بورڈیکس کے مارسیس نے موہوں کا روحانی علاج بتایا جو آج بھی یورپی معاشروں میں مانا جاتا ہے۔ تم اپنے موہکے کے برابر پتھر کو اپنے موہکے پر گزرو پھر اس پتھر کو شاہ بلوط کے پتے میں باندھ کر عام گزرگاہ پر پھینک دو۔ جو شخص اس پتھر کو چھوئے گا اس کو موہکے نکل آئیں گے اور مریض کے موہکے صاف ہو جائیں گے۔ تو ہم پرستی کا شکار لوگ ہمیشہ خوف کی زندگی گزرتے ہیں اور ہمیشہ التاسیدھا سوچتے رہتے ہیں کہ ایسا ہوا تو کیسا ہوگا ایسا کرے تو کیا ہوگا ویسا کرے تو کیا ہوگا کوئی سن نہ لے کوئی دیکھ نہ لے کوئی چھو نہ لے فلاں شخص ایسا ہے فلاں شخص ویسا ہے فلاں شخص ہمارا دشمن ہے فلاں شخص ہم سے جلتا ہے فلاں شخص ہم سے حسد کرتا ہے فلاں شخص عملِ عیلات کرتا ہے فلاں شخص فلاں آدمی سے ملتا ہے جو ٹھیک نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ ذات باری تعالیٰ متصرفِ حقیقی اور مسبب الاسباب ہے۔ ظاہری اسباب میں اثر انگیزی پیدا کرنے والی ذات بھی وہی ہے۔ کسی چیز، کسی دن، کسی مہینے کو منحوس سمجھنا اور اس میں کام کرنے کو بُرے انجام کا سبب قرار دینا غلط اور قابلِ مذمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر کوئی بھی چیز انسان کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اس بارے کتاب و سنت کے بعض دلائل کا ذکر حسب ذیل ہے:

۱۔ قرآن کریم میں مشرکین عرب کے بدشگونی کے ایک عمل کی تردید یوں کی گئی ہے: ”اور یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کی پشت کی طرف آؤ۔“ البتہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص تقویٰ اختیار کرے اور گھروں میں ان کے دروازوں ہی سے آؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔“ (البقرہ، 189) مشرکین حالتِ احرام میں اپنے گھروں میں دروازوں سے داخل ہونے کو نحوست اور بدشگونی کا سبب سمجھتے۔ اس لیے اپنے گھروں کے پیچھے سورخ کر کے یا پیچھے سے چھت پر چڑھ کر اندر آتے اور اس عمل کو بڑی نیکی اور عبادت سمجھتے۔ قرآن حکیم نے ان کے بدشگونی پر مبنی عمل کی تردید فرمائی۔

۲۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لا عدوی ولا طیرہ۔ نہ کوئی تقدیر ہے (ہر مرض اللہ

کی طرف سے آتا ہے نہ کہ بیمار کے پاس بیٹھنے سے) اور نہ کوئی بدشگونی۔ (صحیح بخاری، کتاب الطب) اس حدیث میں بدشگونی کی نفی کر دی گئی کہ کسی چیز سے نحوست اور نقصان پہنچنے کا عقیدہ نہ کیا جائے۔

۳۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: بدشگونی شرک ہے۔ آپ نے یہ کلمات تین بار ادا فرمائے۔ (سنن ابوداؤد، کتاب الطب)

مختلف ایام و مہینوں کو بدشگونی کا سبب قرار دینا شریعت کی خلاف ورزی ہے۔ (i) ماہ صفر کو منحوس قرار دینا درست نہیں۔ (ii) ماہ محرم میں شادی بیاہ کو بدشگونی کا سبب قرار دینا درست نہیں۔ شادی کرنے کے باعث طلاق یا برائی پہنچنے کا عقیدہ رکھنا غلط ہے۔ (iii) اسی طرح مختلف ایام جیسے منگل کے دن شادی یا بچی کی رخصتی کو بدشگونی قرار دیا جاتا ہے۔ ایسے توہمات بھی غلط ہیں سارے دن اللہ تعالیٰ کے ہیں۔ (iv) دو بچیوں کے ایک ہی دن نکاح کو بدشگونی کا سبب قرار دیا جاتا ہے یہ بات بھی بالکل بے اصل ہے۔ ایسے عمل کو کسی بدی سے منسوب کرنا غلط ہے۔ (v) ایک دن دو خطبوں یعنی عید اور جمعہ کے خطبے کو حکمرانوں پر بھاری قرار دینے کا عقیدہ رکھنا بھی بدشگونی ہے۔ بلکہ یہ امر باعث برکت ہے کہ ایک مسلمان کو ایک دن میں دو خطبات سننے کی سعادت میسر آتی ہے۔ اس سے بدشگونی کا عقیدہ وابستہ کرنا انتہا درجے کی توہم پرستی ہے۔ (vi) کسی آدمی نے کسی خاص جانور یا کسی شخص کو دیکھ لیا اور اس کے بعد کوئی ناپسندیدہ واقعہ رونما ہو گیا اس واقعہ کو ان چیزوں سے منسوب کرنا بدشگونی اور توہم پرستی ہے۔ ہماری زندگی میں ضعیف الاعتقادی کے باعث بدشگونی اور توہم پرستی کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اگر ہمارا اللہ تعالیٰ کی ذات پر پختہ اعتقاد ہو، اس کی قدرت پر یقین کامل ہو تو پھر اس قسم کی توہم پرستی اور بدشگونی کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ توحید باری اور اس کے تقاضوں کو مکمل حقہ ماننے کی توفیق عطا فرمائے۔

## لگن کی ایجادات

الیس ہووے (Elias Howe) امریکا کا ایک چھوٹا سا کارگیر تھا۔ وہ 1819ء میں پیدا ہوا اور صرف 48 سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔ مگر اس نے دنیا کو ایک ایسی چیز دی جس نے کپڑے کی تیاری میں ایک انقلاب بھرپا کر دیا، یہ ایجاد سلائی مشین تھی۔ الیس ہووے نے جو مشین بنائی تھی اس کی سوئی میں دھاگا ڈالنے کے لئے سوراخ سوئی کی جڑ کی طرف ہوتا تھا جیسا کہ عام طور پر ہاتھ کی سوئی میں ہوتا ہے۔ ہزاروں برس سے انسان سوئی کی جڑ میں سوراخ کرتا آ رہا تھا۔ اسی لئے الیس ہووے نے بھی جب مشین تیار کی تو اس کی سوئی میں ”عام رواج“ کے مطابق جڑ کی طرف ہی سوراخ کیا۔ لیکن اس کی مشین ٹھیک طرح سے کام نہیں کر پارہی تھی، شروع شروع میں صرف جوتے ہی سیتا تھا کپڑوں میں وہ مشین کام نہیں کرتی تھی۔ وہ کافی عرصہ تک اسی فکر میں مگن رہا لیکن اس کی سمجھ میں اس کا کوئی حل نہ آیا۔ آخر کار ایک مرتبہ اس نے ایک خواب دیکھا کہ کسی وحشی قبیلہ کے آدمیوں نے اس کو پکڑ لیا ہے اور اس کو حکم دیا ہے کہ وہ ایک دن کے اندر سلائی کی مشین بنا کر تیار کرے ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ اس نے کوشش کی مگر مقررہ مدت میں وہ مشین تیار نہ کر سکا، جب وقت پورا ہو گیا تو قبیلہ کے لوگ اس کو مارنے کے لئے دوڑے، اُن کے ہاتھ میں برچھا تھا ہووے نے غور سے دیکھا تو ہر برچھے کی نوک پر ایک سوراخ تھا، بس یہی دیکھتے ہوئے اس کی آنکھ کھل گئی، اور اس کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ چنانچہ اس نے ہر برچھے کی طرح سوئی کی جڑ کے بجائے نوک کی طرف سوراخ کیا تو مشین ٹھیک طرح سے کام کرنے لگی۔

دراصل الیس ہووے کی مشکل یہ تھی کہ وہ ”رواجی ذہن“ سے اوپر اٹھ کر سوچ نہیں پاتا تھا، وہ سمجھ رہا تھا کہ جو چیز ہزاروں سال سے چلی آ رہی ہے وہی صحیح ہے، لیکن جب اس کے لاشعور نے اس کو تصویر کا دوسرا رخ دکھایا اس وقت وہ معاملہ کو سمجھا اور اس کو فوراً حل کر لیا۔ یہ صرف ایک واقعہ ہے ورنہ تاریخ میں کتنے ایسے واقعات ہیں، جب آدمی کسی کام کی لگن میں مگن رہتا ہے تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آتا ہے، اگرچہ وہ خواب ہی کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو۔

ہم اکثر و بیشتر دیکھتے رہتے ہیں کہ جو لوگ سارا دن جس کام میں لگے رہتے ہیں رات کو خواب میں بھی وہی کام کرتے رہتے ہیں، گاڑیوں کے کنڈیکٹر اور لنڈے بازار میں آوازیں لگا لگا کر اشیاء فروخت کرنے والے رات کو نیند میں بھی یہی آوازیں لگا رہے ہوتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ ایسا کوئی نہ کوئی واقعہ بھی ضرور ہوا ہوگا۔ میں جب چھوٹا تھا اس وقت مجھے کسی بات پر میرے ایک عزیز نے سب کے سامنے ڈانٹا جس سے مجھے سخت ڈکھ ہوا، میں بھی سخت غصے میں آ گیا اور یہ ڈکھ اور غصہ اتنا سوار ہوا کہ رات کو نیند میں بھی میں چلا چلا کر لڑ رہا تھا جس کی خبر مجھے صبح گھر والوں نے دی۔

انڈیا کے ایک بزنس میں کو اپنی انٹرکنٹیننٹل بنانے والی کمپنی کے لئے ”سلوگن“ کی ضرورت تھی، اس نے اخبار میں اشتہار دیا کہ جو اچھا سلوگن دے گا اسے انعام دیا جائے گا۔ چنانچہ بہت سارے لوگوں نے سلوگن دیے لیکن اسے کوئی بھی پسند نہ آیا۔ وہ ہر وقت اسی فکر میں لگن رہتا تھا اس دوران سوچتے سوچتے چھ سال کا عرصہ بیت گیا، بالآخر ایک دن اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک باغ میں ہے جہاں کا موسم نہایت ہی سہانا ہے، طرح طرح کی چڑیاں درختوں پر بیٹھی ہوئی ہیں، یہ منظر دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا اور بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا:

ویدر (Weather) ہو تو ایسا

یہ کہتے ہی اس کی آنکھ کھل گئی اور اس کا چھ سال سے لٹکا مسئلہ بھی حل ہو گیا، چنانچہ اس نے اسی جملے کو اپنی کمپنی کا سلوگن بنا لیا۔ خواب دراصل کسی بھی کام میں گہری وابستگی کا نتیجہ ہوتا ہے ایسے آدمی کے کام کرنے کی صلاحیت بارہ گھنٹے کے بجائے چوبیس گھنٹے ہو جاتی ہے۔

ہم اکثر و بیشتر نا کام ہو جاتے ہیں اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ لگن اور گہری وابستگی سے کام نہیں کرتے، جلد باز ہوتے ہیں ہر کام کا نتیجہ جلدی اور اپنی مرضی کا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس اگر ہم اپنے آپ کو کسی کامیابی کے حصول کے لئے تھکا دیں، ہر ناکامی کے بعد دوبارہ کوشش کریں اور گہری وابستگی اختیار کریں تو ہمارا لا شعور اور خواب بھی ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ کسی بھی تخلیق حل کی کوشش میں ہمیں نا آسودگی، بے آرامی اور بے چینی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تھامس ایڈیسن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بال بیرنگ ہاتھوں میں لے کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا تھا اور تھوڑی دیر کے لئے سونے کی کوشش کرتا۔ جلد وہ ایسی حالت میں ہوتا کہ آدھا جاگ رہا ہوتا اور آدھا سویا ہوا ہوتا۔ جب وہ کافی پرسکون ہو جاتا تو بال بیرنگ نیچے گرنے سے جاگ جاتا اور تب وہ جلد از جلد ان خیالات کو لکھ لیتا جو خواب کی حالت

میں اس کے ذہن میں داخل ہوئے تھے۔ انسان کے خیالات میں بھی اللہ تعالیٰ نے قوت رکھی ہے اور یہ قوت بڑے بڑے کام سرانجام دیتی ہے، چنانچہ اہل سنت والجماعت کے عقائد میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ”نظر لگنا حق ہے“، یعنی کسی آدمی کی نظر لگ سکتی ہے۔ یہ نظر لگنا دراصل انسان کی قوت خیالیہ ہوتی ہے۔ اُن پڑھ آدمی جس کے دماغ میں زیادہ خیالات نہ گھوم رہیں ہوں وہ جب کسی چیز کو دیکھ کر حیران ہوتا ہے تو مکمل دیہان سے اس چیز کی طرف چند لمحوں کے لئے حیرت سے دیکھتا ہے جس سے اس چیز کو نظر لگ جاتی ہے۔ یہ قوت خیالیہ مشق سے پیدا کر کے کچھ لوگ عجیب و غریب کام بھی کرتے ہیں، جسے آج کل کی اصطلاح میں ٹیلی پتھی، پٹناٹزم یا مسمریزم کہا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح اگر ہم کسی کام کی لگن میں اتنے لگن ہو جائیں کہ ہر وقت اسی کا سوچیں، اسی کا بولیں، اسی کا سنیں تو لازماً ایک وقت آئے گا کہ ہمارا لاشعور اس چیز کے بارے میں نئے نئے انکشافات کرے گا۔



## (25 دسمبر)

## یوم قائد اعظم کے موقع پر خصوصی تحریر

بانی پاکستان محمد علی جناح کے بارے عام تصور یہ پھیلا یا جاتا ہے کہ وہ سیکولر اور لادین ذہن کے مالک تھے، جبکہ انکی زندگی کے متعدد واقعات اس غلط تصور اور فرضی خیال کی مکمل نفی کرتے ہیں۔ بہت اوائل اور نوجوان عمری میں جب کہ انسان کی اپنی سوچ ابھی پختہ نہیں ہوئی ہوتی اور گھریلو تربیت کا بہت سا اثر باقی ہوتا ہے جب قائد اعظم محمد علی جناح انگلستان پہنچے اور قانون کی تعلیم کے لیے تعلیمی ادارے کے انتخاب کا مرحلہ درپیش ہوا تو دوا داروں میں سے اس ادارے کا انتخاب کیا جس کے باہر دنیا کے مشہور قانون دانوں کی فہرست میں سب سے اوپر محسن انسانیت کا نام مبارک لکھا تھا۔ قانون کی تعلیم سے فارغ ہوئے لندن کے ایک ڈرامیٹک کلب میں شمولیت اختیار کر لی اور ان سے ادائیگی کا چیک بھی وصول کر لیا۔ ایک ڈرامے کی مشق کے دوران قائد اعظم سے کہا گیا کہ ایک لڑکی کے چہرے پر بوسہ لیں، اس وقت ان کی عمر 19 برس کی تھی، ہندوستان کے ایک نوجوان کے لیے یہ محض ایک حسین خیالی بات تھی کہ وہ لندن جیسے شہر میں برطانوی لڑکی کا بوسہ لے لیکن قائد اعظم نے محض یہ کہ کر ڈرامے کا یہ منظر مشق کرنے سے انکار کر دیا کہ میرے مذہب میں اسکی اجازت نہیں ہے۔

ہندوستان میں اپنے والد بزرگوار محترم پونجا جناح کو خط لکھا کہ میں قانون کی تعلیم میں آگے بڑھنے کی بجائے ڈرامے کے میدان کا انتخاب کیا ہے اور ایک کلب میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔ والد نے جوابی خط میں سختی سے اس بات سے منع کیا اور حکم دیا کہ فوراً کلب سے مستعفی ہو کر تو قانون کی مزید تعلیم جاری رکھو۔ قائد اعظم نے ابھی وہ چیک بھنویا نہ تھا اور بغیر کسی پس و پیش کے یہ کہ کر کلب والوں کو لوٹا دیا کہ یہ میرے والد کا حکم ہے اور میرے مذہب میں والدین کی نافرمانی کی گنجائش نہیں۔ قانون کی تعلیم کے بعد ہندوستان لوٹے اور بیسے میں وکالت کا آغاز کیا۔ بیسے آزاد خیالی میں اس زمانے کے دوران بھی لندن اور پیرس سے کسی طور کم نہ تھا، ایک نوجوان اور خوبصورت مجوسی لڑکی قائد اعظم پر فریفتہ ہو گئی، ہر طرح سے مایوس ہو چکنے کے بعد جب اس نے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تو قائد اعظم نے

کہا مذہب کا اختلاف اسکی اجازت نہیں دیتا۔ وہ مذہب تبدیل کرنے پر آمادہ ہوئی تو اٹھارہ سال کی قانونی مدت پوری ہونے تک اسے ایک سال کا انتظار کرنا پڑا۔ ایک برس بعد وہ عدالت سے مسلمان ہونے کی ڈگری لائی تب قائد اعظم نے اس سے نکاح کیا۔

ہندوستان کے حالات سے مایوس ہونے کے بعد وہ ایک بار پھر انگلستان سدھار گئے کہ اب نہ لوٹیں گے۔ لیکن آفریں ہو علامہ ڈاکٹر محمد اقبال پر جنہوں نے خط لکھ کر انہیں واپس بلایا اور غلامی کے اس پر آشوب دور میں مسلمانوں کی قیادت کرنے کے لیے تیار کیا۔ سوال یہ ہے کہ قائد اعظم اگر سیکولر اور لادین ذہن کے مالک تھے تو علامہ اقبال جیسا درد دل رکھنے والا بنیاد پرست مسلمان کی نظر انتخاب ان پر کیوں پڑی؟ کیا علامہ محمد اقبال جیسا راسخ العقیدہ مسلمان کہ جس کا ہاتھ تاریخ کی نبض پر تھا وہ مسلمانوں کی قیادت کے لیے ایک لادین شخص کا انتخاب کرتا؟ ہرگز نہیں گزشتہ مذکورہ واقعات اور ان صفحات میں آئندہ آنے والی تحریری شہادتیں اس امر کی قطعی نفی کرتی ہیں۔

تحریک پاکستان کے دوران قائد اعظم کی تقاریر جہاں پاکستان کو نظریاتی اساس فراہم کرتی ہیں وہاں انکے ذہن تک رسائی کا بھی ایک وسیع ذریعہ ہیں، ذیل میں انکی تقاریر سے چند اہم اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں:

”کوئی شبہ نہیں کہ لوگ ہمارا مدعا پوری طرح نہیں سمجھتے، جب ہم اسلام کا ذکر کرتے ہیں تو اسلام صرف چند عقیدوں، روایتوں اور روحانی تصورات کا مجموعہ نہیں۔ اسلام ہر مسلمان کے لیے ایک ضابطہ بھی ہے جو اسکی زندگی اور کردار کو سیاست اور معیشت تک کے معاملات میں انطبات عطا کرتا ہے“ قائد اعظم (کرم حیدری، قائد اعظم کا اسلامی کردار، صفحات 101، 102 مکتوبات حرمت راولپنڈی 1984ء)

”قرآن مجید کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا سیاسی معاشرتی اور معاشی غرض یہ کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطے سے باہر ہو۔“ قائد اعظم (کرم حیدری، قائد اعظم کا اسلامی کردار، صفحہ 103)

”اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس میں اطاعت و وفائیکش کا مرجع خدا کی ذات ہے۔۔۔ قرآن مجید کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کر سکتے ہیں اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔“ قائد اعظم (کرم حیدری، قائد اعظم کا اسلامی کردار، صفحہ 103)

”وہ کونسا رشتہ ہے جس میں تمام مسلمان منسلک ہو کر جسد واحد کی طرح ہو جاتے ہیں۔ وہ رشتہ خدا کی کتاب قرآن مجید ہے، ایک خدا ایک رسول ایک امت“ قائد اعظم (سعید راشد، قائد اعظم گفتار و کردار، صفحہ 513، مکتبہ میری لائبریری لاہور 1986)

”ہماری اسلامی تہذیب کو کوئی نہیں مٹا سکتا، اس اسلامی تہذیب کو جو ہمیں ورثے میں ملی ہے۔ ہمارا نور ایمان زندہ ہے، ہمیشہ زندہ رہے گا۔ دشمن بے شک ہمارے اوپر ظلم کرے، ہمارے ساتھ بدترین سلوک روا رکھے لیکن ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں اور ہم نے یہ سنگین فیصلہ کر لیا ہے اگر مرنا ہی ہے تو لڑتے لڑتے مریں گے“ قائد اعظم (آغا اشرف۔ مرقع قائد اعظم صفحہ 41 مقبول ایڈیٹ لاہور 1992)

”مسلمان ایک جھوٹے احساس سلامتی میں مبتلائے فریب رہے اور اقلیت کی اصطلاح کو تاریخی، آئینی اور قانونی سمجھا جانے لگا لیکن مسلمان کسی حیثیت سے بھی یورپی ممالک کی اقلیت نہیں ہیں، ایک چیز قطعی ہے اور وہ یہ کہ ہم کسی طرح بھی اقلیت نہیں ہیں بلکہ ہم اپنے نصب العین کے ساتھ بجائے خود ایک علیحدہ اور ممتاز قوم ہیں“ قائد اعظم (ڈاکٹر اسعد گیلانی، اقبال، قائد اعظم اور مولانا مودودی، صفحہ 75)

”پاکستان اس دن وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان کا پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا، مسلمانوں کی قومیت کا بنیادی کلمہ توحید ہے وطن نہیں اور نہ ہی نسل۔ آپ نے غور کیا کہ پاکستان کے مطالبے کا جذبہ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال بلکہ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے۔“ قائد اعظم (ڈاکٹر اسعد گیلانی، اقبال، قائد اعظم اور مولانا مودودی، صفحہ 75)

قائد اعظم کے ان فرمودات واضح طور پر یہ پتہ دیتے ہیں کہ وہ کبھی بھی سیکولر نہیں رہے، زمانہ طالب علمی اور پیشہ ورانہ زندگی کے واقعات اور تحریک پاکستان کے دوران تقریروں کے اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں اسلامی تعلیمات پوری طرح راسخ تھیں۔ ایک بار انہوں نے قرآن مجید کو بھی پوری طرح پڑھ چکے کا عندیہ دیا تھا لیکن اردو، عربی اور فارسی سے بہت زیادہ واقفیت نہ ہونے کے باعث وہ ہندوستان کی روایتی مذہبیت سے دور ہی رہے۔ پھر کیا یہ ایک تاریخی شہادت نہیں ہے کہ غازی علم دین شہید کا مقدمہ قائد اعظم نے اس وقت مفت لڑا تھا جب کہ انکا شمار ہندوستان بھر کے مہنگے ترین وکیلوں میں ہوتا تھا۔

تحریک پاکستان کے دوران ہندو قیادت نے انگریزوں سے مراعات لینے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی کتاب میں نہرو کی بیوی سے تعلقات تک کا ذکر بھی کیا ہے، لیکن اس طرح کے ماحول میں رہنے اور طویل جنگ لڑنے کے باوجود محترمہ فاطمہ جناح کو مردوں سے ہاتھ ملانے تک کی اجازت نہ تھی، حتیٰ کہ کسی نے انہیں منگے سر بھی نہ دیکھا۔ تقسیم ہند میں اس طرح کے رویے سے مسلمانوں کا نقصان بھی ہوا لیکن قائد اعظم نے یہ ثابت کیا کہ ایک سچے مسلمان کے لیے ایمان اور شرم و حیا سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہوتا۔ زیارت ریزیدنی میں قائد اعظم نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے، انکے خدمتگار سے جب ان ایام کا احوال پوچھا گیا تو اس نے بہت ساری باتوں کے ساتھ ساتھ انکی آخری نماز کا بھی تذکرہ کیا، اس کے بقول قائد اعظم باقاعدگی سے فقہ حنفی کے مطابق نماز ادا کرتے تھے آخری نماز جو انہوں نے ادا کی اس کا حال خدمت گار کی زبانی سنئے ”ظہر کی نماز کی ادائیگی کے بعد انہوں نے کہا کہ عصر کا وقت ہوئے ہی مجھے بیدار کر دینا میں نے کہا جی اچھا، لیکن آنکھ کھلنے پر انہوں نے استفسار کیا کہ کیا ابھی عصر کا وقت نہیں ہوا؟ میں کہا ہوا چکا ہے لیکن آپ ابھی آرام کر لیں، میں تھوڑی دیر بعد آپ کو نماز پڑھا دوں گا کیونکہ نقاہت بہت زیادہ تھی، انہوں نے فرمایا کہ نہیں اول وقت میں نماز کی ادائیگی پسندیدہ ہے پس تکیہ میری کمر کے نیچے کر دو تو میں نماز پڑھ لوں، وضو کے بعد یہ انکی زندگی کی آخری نماز تھی جس کے بعد وہ قوے میں چلے گئے اور بالآخر اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔“ قائد اعظم کا یہ خدمتگار ہنوز زندہ ہے اور جدہ (سعودی عرب) میں اقامت پزیر ہے، اسکی یہ روایت ہمارے استاد محترم مولانا عبدالحجید اخوان کے ذریعے براہ راست ہم تک پہنچی۔

قائد اعظم کی اولاد چونکہ اسلام سے گریزاں رہی اسی لیے قائد اعظم بھی ان سے گریزاں رہے اور پورا بڑھا پا کنواری بہن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گزاردیا۔ جب انتقال ہوا تو وصیت میں یہ لکھ کر گئے کہ ایک حدیث نبویؐ کے مطابق چونکہ مسلمان کسی کافر کا اور کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا اس لیے میرے ترکے میں سے ایک پائی بھی میری اولاد کو نہ دی جائے اور اپنی کل جائیداد جس کی کثرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں انکے پاس اپنا ذاتی ہوائی جہاز تھا، ساری کی ساری نوزائیدہ اسلامی مملکت پاکستان میں مدرسۃ الاسلام سندھ اور اسلامیہ کالج پشاور کے نام کر گئے۔ قائد اعظم اگر سیکولر اور لادین خیالات کے مالک ہوتے تو علامہ شبیر احمد عثمانی جیسے جید عالم دین انکی نماز جنازہ کیوں پڑھاتے؟ ٹھیک ہے وہ اس طرح سے مذہبی انسان نہ تھے جس کا تصور ہمارے ہاں پایا جاتا ہے لیکن بہر حال وہ ایک راسخ العقیدہ اور پکے مسلمان تھے۔ جن فاضل مصنفین نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر انہیں سیکولر

ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اس سے بھی قائد اعظم کے پختہ ایمان کی تصدیق ہوتی ہے کہ اگر کسی زمانے میں ان پر سیکولر خیالات کا سایہ رہا بھی ہے تو وہ اسلام اور قرآن کے مطالعے کے بعد ان فرسودہ خیالات سے دستکش ہو کر تو شعوری طور پر اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا رہے اور ایک سچے مسلمان اور امت محمدی کے فرد کی حیثیت سے اپنے رب کے حضور پیش ہوئے۔

اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہوا کرتا ہے، اگر قائد اعظم کی نیت ایک سیکولر ریاست بنانے کی تھی تو وہ ریاست اسلام کا قلعہ کیسے بن گئی؟ حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر میں تبلیغ و ارشاد کے لیے یہاں سے جماعتیں روانہ ہوتی ہیں، دنیا بھر میں جہاں جہاں جہاد کا میدان سجا اس کے لیے اسی مملکت خدا داد پاکستان نے اپنے سپوت اور عسکری راہنمائی کے ساتھ ساتھ ممکنہ وسائل بھی فراہم کیے، تین سو سال کے بعد امت کو دفاع کے میدان میں ایٹمی قوت کی خوشخبری اسی اسلامی ریاست سے میسر آئی اور مستقبل میں بھی مشرق سے مغرب تک کل مسلمانوں کی امیدیں اسی پاکستان سے وابستہ ہیں گویا پاکستان، اس حدیث نبوی کی عملی تصویر بنا کہ ”مجھے مشرق سے ٹھنڈی ہوا آتی ہے“ اور اس سب کا سہرا قائد اعظم کے سر ہے۔ دراصل تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں پر ملوکیت کا سایہ ہو یا غلامی کی اندھیری غار، خدا روں کی دعا بازیاں ہوں یا دشمن کے پالتو لوگوں کی حکمرانیاں، سازشوں کے جال ہوں یا تہذیبی و ثقافتی یلغار اس امت کی کوکھ قیادت کے میدان میں ہمیشہ سرسبز و شاداب رہی ہے، یہ آخری نبی کی دعاؤں کا ثمرہ ہے اقوام عالم کو صدیوں کے بعد کوئی قابل قدر راہنما میسر آتا جسے وہ قرون تک یاد رکھتے ہیں اور کتنی ہی قومیں محض اس لیے تاریخ کے صفحات میں دفن ہو گئیں کہ انہیں کوئی راہنما میسر نہ آیا جبکہ امت مسلمہ کا دامن کبھی بھی مخلص دیندار اور جرات مند قیادت سے خالی نہیں رہا۔

اللہ کرے مدارس اسلامیہ سے قال اللہ تعالیٰ اور قال قال رسول اللہ کی صدائیں بلند ہوتی رہیں، اللہ کرے مساجد کے مینار صدائے بلالی کے امین رہیں، اللہ کرے ختم نبوت اور علی مولائیت سے اس امت کے نوجوانوں کے سینے سرشار رہیں اور اللہ کرے اس امت کا اجتماعی ضمیر ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے کہ یہی عناصر ہیں بانی پاکستان جیسی صاف ستھری قیادت کی فراہمی کے اور یہی امت کے روشن مستقبل کے سنگ ہائے میل ہیں اور میرے اللہ نے چاہا تو وہ دن دور نہیں جب یہی پاکستان شاعر مشرق کے خوابوں کی سچی حسین تعبیر بنے گا اور اس مملکت کی وجہ جواز نظریہ پاکستان کے منکر راندہ درگاہ ہو کر ہمیشہ کے لیے لعنت و ملامت کا نشان بن کر عبد اللہ بن ابی، میر جعفر اور میر صادق کی صف میں شامل ہوں گے۔

(سید عبدالوہاب شیرازی)

## کیا عوام کو ترجمہ قرآن پڑھنا ناجائز ہے؟

آج کل ایک غلط بات مشہور کر دی گئی ہے کہ عوام کو ترجمہ قرآن پڑھنا یا کسی آیت، رکوع کا مفہوم علماء کی تفاسیر سے ذہن نشین کر کے بیان کرنا ناجائز ہے۔ چنانچہ اس غلط بات کو پھیلانے والے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں اور عوام نے قرآن کریم کو محض برکت حاصل کرنے کی کتاب سمجھ کا طاقی نسیان میں رکھ دیا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ یہاں 200 سال تک انگریز حکومت کر کے گیا ہے، اس نے دین اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے ہر طرح کے جتن کیے، کبھی مدارس منہدم کیے تو کبھی علماء کو توپوں کے آگے کھڑا کر کے اڑا دیا گیا، کبھی علماء کو پھانسیاں دیں تو کبھی لاکھوں قرآن مجید کے نسخے جلائے گئے، لیکن انگریز کو اندازہ ہو گیا کہ بزور طاقت اور اسلحہ کے مل بوتے پر ہم مسلمانوں سے اسلام اور قرآن سے لگاؤ نہیں ختم کر سکتے، چنانچہ انہوں نے مختلف تکنیک اور حربوں پر تحقیقات کیں اور بالآخر انگریز فرقہ واریت اور اختلافات کا بیج بو کر چلا گیا اور آج تک ہم اسی فرقہ واریت اور آپس کے فروغی اختلافات میں پھنسے ہوئے ہیں، اسی طرح قرآن مجید سے دور رکھنے کے لئے ایسی باتیں مشہور کر دیں کہ عوام کا تعلق قرآن سے نہ ہو۔ حالانکہ اگر ہم اپنے اسلاف اور اکابرین کی زندگیوں اور تحریروں کو دیکھیں تو انہوں نے ساری زندگی عوام کو قرآن سے جوڑنے میں لگائی اور اسی بات کی دہائی دیتے دیتے دنیا سے چلے گئے۔

میں نے اپنے ان گناہ گار کانوں سے یہ بات بھی سنی ہے کہ اگر عام لوگ ترجمہ قرآن پڑھیں گے تو گمراہ ہو جائیں گے، یہ ترجمہ پڑھنا صرف علماء کا کام ہے۔ حیرت ہوتی ہے دشمن نے کتنی محنت کی، قرآن کریم کے متعلق کیسی کیسی باتیں پھیلا دی گئی ہیں، چنانچہ آج لوگ قرآن کو ہاتھ میں لینا گوارہ نہیں کرتے حالانکہ قرآن کا احترام ان کے دلوں میں بہت ہے، اسے چومتے ہیں، اس کی طرف پیٹھ نہیں کرتے، اس سے اونچا نہیں ہوتے، لیکن پڑھنا صرف علماء کا کام ہے۔

فہم قرآن کے دو پہلو ہیں، ایک تدبر فی القرآن اور دوسرا تذکر بالقرآن۔ تدبر فی القرآن کے لئے بلاشبہ بہت سے علوم کا ماہر ہونا ضروری ہے جیسا کہ مفسرین نے لکھا کہ تیرا چودہ علوم پر دسترس ہونی چاہیے، میرے خیال میں یہ بات بھی پرانی ہو چکی ہے، آج کل تدبر فی القرآن کے لئے کم از کم بیس پچیس علوم جن میں جدید علوم اور فلسفے بھی شامل

ہیں ان سب پر مہارت ہونا ضروری ہے، آج کل مدارس میں پڑھایا جانے والا انصاب اتنا ناقص ہے کہ وہ ایسے علماء پیدا ہی نہیں کر سکتا جو تدبر فی القرآن کی صلاحیت رکھتے ہوں، چہ جائیکہ ہم دورہ حدیث سے فارغ ہو کر سند لینے والے کو اس قابل سمجھیں کہ وہ تدبر فی القرآن کی صلاحیت رکھتا ہے۔ البتہ جہاں تک تعلق ہے تذکر بالقرآن یعنی قرآن سے نصیحت حاصل کرنا تو اس بارے میں خود قرآن کہتا ہے: ولقد یسرنا القرآن لذکر فصل من مدکر؟ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنایا ہے پس ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا، اور یہ نصیحت کا پہلو بلاشبہ محض ترجمہ پڑھنے والے کو بھی میسر ہوتا ہے۔

یاد رکھیے! قرآن اللہ کی مجزا نہ کتاب ہے اس کو پڑھ کر گمراہی نہیں ہدایت پہنچتی ہے، یہ انسان کے دل میں اس حقیقی ایمان کو اپیل کرتا ہے جو انسان کی فطرت میں پیدا اُٹی طور پر رکھا ہوا ہے، یہ اس حقیقی ایمان کی چنگاری کے لئے پٹرول کا کام کرتا ہے، اور اسے یک دم بھڑکا دیتا ہے۔ سوچنے اور غور کرنے کی بات ہے کہ یورپ میں جدی پشتی انگریز غیر مسلم قرآن کریم کا محض ترجمہ پڑھ کر مسلمان کیوں ہو جاتے ہیں، حالانکہ ان کو تو عربی زبان اور ناظرہ قرآن بھی پڑھنا نہیں آتا، وجہ یہی ہے کہ ان کے دل میں بھی فطری طور پر ایمان کی چنگاری موجود ہوتی ہے قرآن کو پڑھ اور سن کر وہ چنگاری بھڑک اٹھتی ہے۔ یورپ کے ایک مسلمان نوجوان کی ویڈیو سوشل میڈیا پر موجود ہے، جس میں دکھایا گیا ہے کہ وہ موبائل پر تلاوت لگا کر مارکیٹوں اور بازاروں میں غیر مسلموں کی طرف ہینڈ فری آگے کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تیس سینڈ تک یہ آڈیو سن کر اپنے کمٹس دو، چنانچہ وہ مختلف چلنے پھرنے والے خواتین و حضرات کو اس طرح قرآن سنا کر ان سے کمٹ لیتا ہے، وہ لوگ سنتے ہوئے بہت حیران ہوتے ہیں ان کے چہرے کے تاثرات سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت متاثر ہوئے ہیں، بعض تو رو بھی پڑتے ہیں۔

بی بی سی کے سابقہ ڈائریکٹر جنرل جان ہٹ کا بیٹا ایچی ہٹ آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، مسلمان ہو گیا، پھر PHD کے لئے اسے جو مقالہ تیار کرنا تھا اس کا عنوان تھا ”یورپ میں پچھلے دس سالوں میں ایسے کتنے لوگ مسلمان ہوئے جو یورپین نسل کے تھے اور کیوں ہوئے“ چنانچہ اس نے دو تین سال تک یورپ میں اس بات پر تحقیق کی اور پھر اپنی رپورٹ پیش کی، جس میں اس نے بتایا کہ پچھلے دس سالوں میں تیرا ہزار لوگ مسلمان ہوئے جن میں سے 80% لوگ قرآن سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے۔ انہیں میں سے ایک امریکی خاتون ”ایم کے ہرمینسن“ بھی تھی۔ جب اس سے اس کے مسلمان ہونے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا: میں سپین میں پڑھتی تھی، ایک دن ہاسٹل میں ریڈیو کی

سوئی گماتے گماتے اچانک ایک عجیب آواز آنا شروع ہوئی چنانچہ میں نے اسے سننا شروع کر دیا، مجھے ایسے لگا کہ یہ میرے دل کے اندر سے آواز آرہی ہے، یا مجھے میرے گمشدہ متاع مل گئی ہے۔ چنانچہ میں کئی دن تک سنی رہی، بالآخر میں نے سوچا کسی سے پوچھوں یہ کس چیز کی آواز ہے اور کیا ہے؟ میں نے جب پوچھا تو مجھے کسی نے بتایا یہ مسلمانوں کی کتاب مقدس قرآن ہے۔ چنانچہ میں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ منگوا کر پڑھنا شروع کیا اور مکمل پڑھا، لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ یہ تو ترجمہ ہے جب تک اصل سورت کو نہ دیکھا جائے اس وقت تک اس کی کوئی حیثیت نہیں، چنانچہ اصل سورت کو سمجھنے کے لئے میں مصر گئی اور قاہرہ یونیورسٹی میں عربی زبان کو سیکھنے کے لئے داخلہ لیا، دو سالہ عربی کو رس کرنے کے بعد پھر اصل عربی قرآن کو پڑھا تو قرآن نے مجھے مسلمان کر دیا۔ یہ ہے قرآن کی ہدایت، اسی لئے قرآن میں بار بار کہا گیا کہ یہ کتاب ہدایت ہے، اس سے ہدایت حاصل ہوتی ہے لیکن عوام میں یہ مشہور کر دیا گیا کہ نعوذ باللہ یہ کتاب گمراہ کرتی ہے، کتنی بڑی توہین کی بات ہے جو لوگوں میں مشہور ہو چکی ہے۔

میرے خیال میں جتنے بھی فرقے اٹھے اور گمراہیاں پھیلی ہیں وہ عوام نے نہیں پھیلانیں، وہ ایسے لوگوں نے ہی پھیلانی ہیں جو قرآن و حدیث کے عالم تھے، مثلاً مرزا غلام احمد قادیانی عام آدمی نہیں تھا، قرآن و حدیث کا علم رکھنے والا تھا، تبھی تو اس نے اپنے نبی اور مہدی ہونے کی قرآن و حدیث سے من گھڑت دلیلیں بنا کر دیں۔ اسی طرح غلام احمد پرویز بھی کوئی عام شخص جو محض کسی عالم کے لکھے ہوئے ترجمے پر اکتفاء کرنے والا نہیں بلکہ دینی علوم کا ماہر اور حنفی سنی گھرانے میں پیدا ہونے کے علاوہ چشتیہ سلسلے کے صوفی بزرگ مولوی رحیم بخش کا پوتا تھا، ابتدائی دینی تعلیم بھی اپنے والد اور دادا سے حاصل کی، تبھی تو غلام احمد پرویز نے حدیث کی ایسی ایسی تعبیریں کیں کہ الامان والحفیظہ۔ یہ نام میں نے بطور مثال پیش کیے ہیں باقی فرقوں کے بانیوں کے نام پیش کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا، ورنہ آج جتنے فرقے ہمارے ہاں ہیں ان کے بانیوں کو دیکھیں سب قرآن و حدیث کے عالم تھے، عربی کے ماہر تھے، صرف نحو، ادب، علم کلام، منطق پر عبور حاصل تھا۔ عام آدمی کے تو بس کی بات ہی نہیں کہ وہ کوئی گمراہی بنایا پھیلا سکے، میرے پاس ایسی ایک بھی مثال نہیں کہ ایک عام آدمی جسے نہ عربی آتی ہو اور نہ دیگر علوم، اور اس نے قرآن کا ترجمہ پڑھ کر کوئی گمراہی ایجاد کی ہو اور پھر وہ آج تک چلی آرہی ہو، عام آدمی جب ترجمہ پڑھتا ہے اس کی نظر اور دیہان قرآن کے تذکیری پہلو کی طرف ہوتا ہے، اسے یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ آ جاتی ہے کہ شراب، جوا، سود، مردار حرام ہیں، جنت میں نعمتیں ہیں، جہنم میں عذاب ہیں، دنیا امتحان کی جگہ ہے وغیرہ۔ البتہ جو خدشات اس حوالے سے پیدا ہو سکتے ہیں ان کے سد باب کے

لئے علماء کی طرف سے مسلسل ہدایات مسلمانوں کو ملتی رہیں تو کوئی حرج نہیں۔

یہاں اس بات سے انکار کرنا بھی ممکن نہیں کہ بلاشبہ ان گمراہیوں کا سد باب بھی علمائے حق نے ہر دور میں اپنا خون دے کر کیا ہے، اور علماء کی خدمات اور محنت سے ہی یہ قرآن و سنت آج اصل حالت میں ہمارے پاس موجود ہیں اور آج بھی علمائے حق قرآن و سنت کی حفاظت اور اختلافات کو ختم کرنے کے لئے اپنا تن من و دھن لگا رہے ہیں، اگرچہ ایسے علماء کو وقفے وقفے سے چن چن کا ٹارگٹ بھی کیا جا رہا ہے۔

اس موضوع کے حوالے سے اکابر علماء اور اسلاف کے چند اقوال پیش خدمت ہیں، ملاحظہ فرمائیے:

حضرت شیخ الہند کے شاگرد خاص، تحریک ریشمی رمال کے سرکردہ رکن، اسیر المائے مولوی انیس احمد رحمہ اللہؒ انوار القرآنؒ میں لکھتے ہیں:

جو لوگ عربی جانتے ہیں وہ اس کو سمجھ سکتے ہیں۔۔۔ اور جو لوگ عربی نہیں جانتے ان کے لئے بہترین ترجمے موجود ہیں۔ وہ ان کے ذریعے سے سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ ہم قرآن کو بالکل نہیں سمجھ سکتے، اس کے سمجھنے کے لئے بہت سے مختلف علوم و فنون حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور بڑے جید عالم ہونے کی ضرورت ہے (صفحہ 35)

شاہ اسماعیل شہید تقویۃ الایمان میں لکھتے ہیں: اس زمانہ میں دین کی بات میں جو لوگ کتنی راہیں چلتے ہیں، کوئی پہلوں کی رسموں کو پکڑتے ہیں، کوئی قصے بزرگوں کے دیکھتے ہیں اور کوئی مولویوں کی باتوں کو جو انہوں نے اپنی ذہن کی تیزی سے نکالی ہیں سند پکڑتے ہیں۔ اور یہ عوام الناس میں مشہور ہے کہ اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سمجھنا بہت مشکل ہے، اس کو بڑا علم چاہیے، ہم کو وہ طاقت کہاں کہ ان کا کلام سمجھیں اور اس راہ پر چلنا پڑے، یہ بزرگوں کا کام ہے، سو ہماری کیا طاقت ہے کہ اس کے موافق چلیں، بلکہ ہم کو یہی باتیں کفایت کرتی ہیں۔ سو یہ بات بہت غلط ہے، اس واسطے کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں باتیں بہت صاف صریح ہیں، ان کا سمجھنا مشکل نہیں اور اللہ اور رسول کے کلام کو سمجھنے میں بہت علم نہیں چاہیے کہ پیغمبر تو نادانوں کو راہ بتانے اور جاہلوں کو سمجھانے اور بے علموں کو علم سکھانے کو آئے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورہ جمعہ میں فرمایا: وہ اللہ ہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے پیغمبر بنا کر بھیجا، وہ ان کو خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، ورنہ اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں مبتلا تھے۔ (المجموعہ 2)

سو جو کوئی یہ آیت سن کر پھر کہنے لگے کہ پیغمبر کی بات سوائے عالموں کے کوئی سمجھ نہیں سکتا اور ان کی راہ پر سوائے بزرگوں کے کوئی نہیں چل سکتا۔ سو اس نے اس آیت کا انکار کیا۔ اس بات کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک بڑا حکیم ہو اور ایک بہت بیمار، پھر کوئی شخص اس بیمار سے کہے کہ فلا نے حکیم کے پاس جاؤ اور اس سے علاج کرو تو وہ کہے اس سے علاج کروانا تو بڑے بڑے تندرستوں کا کام ہے میں تو بہت بیمار ہوں۔ سو وہ بیمار احمق ہے اور اس حکیم (قرآن) کی حکمت سے انکار رکھتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اپنے فارسی ترجمے ”فتح الرحمن“ کے دیباچے میں فرماتے ہیں:

جس طرح لوگ مثنوی مولانا جلال الدین، گلستان شیخ سعدی و منطق الطیر شیخ فرید الدین عطار و قصص فارابی و نجات مولانا عبدالرحمن اور اسی قسم کی کتابیں پڑھتے ہیں اسی طرح قرآن شریف کا ترجمہ بھی پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ اگر وہ کتابیں اولیاء اللہ کا کلام ہیں تو قرآن مجید خود اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اگر ان میں حکماء کے وعظ ہیں تو قرآن مجید میں احکم الحاکمین کے فرمان ہیں۔

اسیر الملوٰی انیس احمدؒ قرآن سے استفادہ کی ایک مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں: اس کی مثال یہ ہے کہ پانی سے اس زمانے میں بھاپ حاصل کر کے مختلف کام لئے جاتے ہیں اور ریل گاڑیاں وغیرہ چلائی جاتی ہیں۔ پانی سے یہ کام صرف وہ لوگ لے سکتے ہیں جو سائنس (علم) سے واقف ہیں، لیکن ہر شخص چاہے وہ کیسا ہی جاہل ہو پانی سے اپنی پیاس بجھا کر زندگی کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح مذہبی اور روحانی زندگی کے قائم رکھنے کے لئے جس آب حیات کی ضرورت ہے اس کو ہر شخص خواہ وہ جاہل ہو یا عالم، قرآن مجید کے بحرِ خاثر سے با آسانی حاصل کر سکتا ہے۔ البتہ جو شخص زیادہ عالم ہو گا وہ علم و حکم کے زیادہ موتی اس سمندر سے حاصل کر سکتے گا۔ ہم اس خطرناک غلطی میں مبتلا ہیں کہ چونکہ ہم بڑے عالم نہیں اور ہم قرآن مجید کے زیادہ نکات نہیں سمجھتے اس لئے ہم کو قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس تباہ و برباد کر دینے والی غلطی کی وجہ سے ہمیں قرآن مجید سے محرومی ہوتی جا رہی ہے اور ہماری مذہبی اور روحانی حیات کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ (انوار القرآن صفحہ 41)

مولوی انیس احمدؒ اسے خطرناک اور تباہ و برباد کر دینے والی غلطی قرار دے رہے ہیں۔ اسی بات کی طرف ایک حدیث میں بھی اشارہ ہے: ان الله يرفع بهذا الكتاب اقواما ويضع به آخرين۔ بے شک اللہ اس کتاب کے

ذریعے بہت ساری قوموں کو عروج اور بہتوں کو زوال دیتا ہے۔ یعنی جو اس سے تعلق توڑ دیتے ہیں وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہو جاتے ہیں۔

مزید لکھتے ہیں جب سے ہم قرآن کی اصلی تعلیم سے دور ہوتے گئے ہیں ہم برابر تنزل کر رہے ہیں۔ اور جیسی قوم کی حالت ہوتی ہے ویسے ہی اس کے اخلاق ہوتے ہیں، اگر قوم زندہ ہوتی ہے تو اس کے افراد میں جرأت، ہمت، استقلال، ترقی کی امنگ، ایثار، قربانی جیسے عمدہ اخلاق ہوتے ہیں۔ اور اگر قوم مردہ ہو تو اس کے افراد پست ہمت، سست، بزدل ہوتے ہیں۔ قومی تنزل کا مردہ اقوام میں اس قدر اثر ہوتا ہے کہ عمدہ الفاظ کے مفہوم بھی بگڑ کر خراب ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب مسلمانوں میں کچھ جان تھی تو اُن میں وعدہ اور قول و قرار کا دوسرا مفہوم تھا اور جب اُن پر مُردنی چھا گئی تو انہی الفاظ کا دوسرا مفہوم ہو گیا۔ چنانچہ پہلے مشہور تھا:

”قول مرداں جان دارد“

پھر یہ حالت ہوئی

”وعدہ آساں ہے ولے اس کی وفا مشکل ہے“

پھر اس کے بعد یہ حالت ہو گئی

”وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا“

اسی طرح جب ہم نے قرآن کو چھوڑا، ہماری حالت خراب ہوئی تو قرآن کے مفہوم بھی بدل گئے۔

واقعی آج ہم اسی طرح کی صورت حال سے دوچار ہیں، اس مفہوم کے بدلنے کا نقصان یہ ہوا کہ آج ہماری ایسی جماعتیں جو بلاشبہ دین کا کام کرنے میں مصروف ہیں لیکن ایک ہی آیت کے مفہوم کو اپنے اپنے کام پر چسپاں کرنے کے لئے آپس میں ہی لڑ رہی ہیں۔ جس کا نقصان دین کو بھی ہو رہا ہے اور خود ان کا کام بھی متاثر ہو رہا ہے۔



## سستی مولی سے مہنگے امراض کا علاج

ریقان کے مریضوں کیلئے تو یہ بے حد فائدہ مند سبزی ہے اس کے ساتھ گلوکھانے سے یہ جلد ہضم ہو جاتی ہے۔ جگر اور تلی کے امراض کیلئے بے حد مفید ہے۔ پیشاب کا جل کر آنا یا رک رک کر آنا مولی کھانے سے ٹھیک ہو جاتا ہے مولی کو زیادہ تر کچا کھایا جاتا ہے مگر پکا کر کھانے سے یہ اور بھی لذیذ بن جاتی ہے اس کی دو قسمیں مشہور ہیں سفید مٹھ والی اور سبز مٹھ والی یہ لمبی اور شلجم کی مانند گول ہوتی ہے چین کی مولی کو ہاری ریڈش کہا جاتا ہے میدانوں میں یہ ستمبر سے نومبر تک اور اور پہاڑی علاقوں میں اکتوبر تا جنوری تک ہوتی ہے۔

مولی کے طبی خواص اور علاج

گردے اور مثانہ میں پتھری یا ریت آنے میں اس کا استعمال اکسیر اعظم ہے اس کا متواتر استعمال ان امراض کا شافی علاج ہے خود دیر سے ہضم ہوتی ہے مگر دوسری غذاؤں کو فوری ہضم کر دیتی ہے اور بواسیر کے مریضوں کیلئے مولی اور اس کے پتوں کا رس بے حد مفید ہے جو جلن اور خارش بھی ختم کر دیتا ہے۔ خرابی جگر میں بے حد مفید ہے۔

ریقان کے مریضوں کیلئے تو یہ بے حد فائدہ مند سبزی ہے اس کے ساتھ گلوکھانے سے یہ جلد ہضم ہو جاتی ہے۔ جگر اور تلی کے امراض کیلئے بے حد مفید ہے۔ پیشاب کا جل کر آنا یا رک رک کر آنا مولی کھانے سے ٹھیک ہو جاتا ہے ریقان والے مولی کا رس کھانڈ میں ملا کر پیئیں افاقہ ہوگا۔

مولی خالی معدہ کھانے سے نقصان ہوتا ہے۔ مولی کا نمک دانتوں پر لگانے سے پائویر یا اور دانتوں کے امراض دور ہو جاتے ہیں۔ مولی کا رس تلوں کے تیل میں ڈال کر پکائیں جب صرف تیل رہ جائے تو اسے بوتل میں ڈال لیں یہ کانوں کے امراض کا شافی علاج ہے۔

دس تولہ مولی کا پانی نمک ملا کر پینے سے بڑھی ہوئی تلی درست ہو جاتی ہے۔ مولی کا رس بچھو پر ڈالیں تو وہ مرجائے گا اور جہاں بچھو نے ڈنگ مارا ہو وہاں روئی سے مولی کا پانی لگائیں زہر کا اثر نسل ہو جائے گا۔

ہاتھوں پر لیں تو پچھو ڈنگ نہ مار سکے گا۔ گنج پروزانہ مولیٰ کارس رگڑنے سے وہاں بال اُگ آتے ہیں۔

مولیٰ کے بچوں کارس بکری کے دودھ میں ملا کر لگانے سے خنازیر کی گلٹیاں دور ہو جاتی ہیں۔ متواتر کھانے سے مثانہ کی پتھری ختم ہو جاتی ہے۔ مولیٰ کا چار بھی ایک اچھی چیز ہے، مولیٰ کے کلڑے کاٹ لیں اور مرتبان میں ڈال کر رکھ لیں عمدہ اور لذیذ اچار بنے گا۔ یہ اچار کھانے سے تلی، بوا سیر، رکا ہوا پیشاب کی تکالیف دور ہو جاتی ہیں۔ مولیٰ کارس نکال کر اسے آگ پر گرم کریں اور گاڑھا ہو جائے تو دھوپ میں رکھ کر اسے سکھالیں۔ یہ جو ہر مولیٰ تیار ہو جائے گا۔ اسے کھانے سے سخت سے سخت درد گردہ کو آرام آ جاتا ہے اور رکا ہوا پیشاب جاری ہو جاتا ہے۔

مولیٰ کا نمک بہت سے امراض کا علاج ہے، سخت بڑی بڑی مولیاں لے لیں، انہیں کاٹ لیں اور باریک کر کے دھوپ میں سکھالیں، خشک ہونے پر انہیں جلا لیں جب راکھ بن جائے اسے پانی میں ڈال دیں اور دو چار دن پڑی رہنے دیں پانی میں نمک آ جائے گا اور راکھ نیچے بیٹھ جائے گی۔ پانی تنھار لیں اسے آگ پر پکا کر خشک کر لیں نیچے جو ہوگا اسے کھرچ کر شیشی میں بھر لیں یہ مولیٰ کا نمک ہوگا۔

مولیٰ کے نمک کے مندرجہ ذیل فوائد ہیں:-

شہد میں ملا کر ایک ایک تولہ نمک مولیٰ کھانے سے دمہ دور ہو جاتا ہے۔ چھاپھ کے ساتھ ایک ماشہ مولیٰ کا نمک روز کھانے سے جگر کے سب ہی امراض دور ہو جاتے ہیں اور یرقان ختم ہو جاتا ہے۔ مولیٰ کا ایک ماشہ نمک گرم پانی سے کھانے سے نزلہ زکام کو آرام آ جاتا ہے۔ نمک مولیٰ چار گنا شہد میں ملا لیں اس کی ایک سلائی آنکھ میں لگانے سے آشوب چشم کو آرام آ جاتا ہے۔ چٹکی بھر مولیٰ کا نمک نسوار بنا کر سو گھلے، دماغ کے کیڑوں، نزلہ اور زکام کیلئے مفید ہے۔ چینی ملا کر مولیٰ کا نمک نصف سے ایک ماشہ تک کھانے سے پرانی کھانسی کو آرام آ جاتا ہے۔ نمک مولیٰ ایک ماشہ بدھضمی کیلئے گرم پانی کے ساتھ دینا ضروری ہے۔ پیشاب رک رک کر آ جاتا ہو یا جل کر آتا ہو تو اس کیلئے ٹھنڈے پانی سے مولیٰ کا نمک دیں۔ مثانہ کی پتھری درد گردہ اور ریت آنے پر بھی یہ نمک اکسیر کا کام کرتا ہے۔ مولیٰ کے رس میں رسونت کو دو گنا پانی ہو تو حل کریں نرم آگ پر اسے پکائیں اور پھر چنے کے برابر گولیاں بنالیں دو تین گولیاں صبح اور شام کھانے سے بوا سیر ختم ہو جائیگی۔



## معاشرے میں بڑھتا ہوا عدم برداشت

عدم برداشت سے نفسیاتی مسائل جیسے خوف، غصہ، چڑچڑاہٹ اور ذہنی الجھنوں کا سامنا رہتا ہے۔ معاشرے میں بہت سی چیزیں مثبت کے بجائے منفی سطح پر تیزی سے گامزن ہو رہی ہیں جو کہ کسی بھی معاشرے کی بقا کے لیے تشویش کا باعث ہے۔

کسی بھی معاشرے کی ترقی کا دار و مدار ایمان داری، برداشت، نردباری اور بھائی چارگی ہے۔ جس معاشرے میں آقا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے وہاں کی سوسائٹی میں اخلاقی گراؤٹ اور عدم برداشت انتہا پر تھی۔ جہاں ایک گھوڑا اگر آگے نکل جاتا تو اس پر لڑائی ہو جاتی تھی یا کسی کے جانور نے اگر پہلے پانی پی لیا تو اس پر کئی نسلوں تک دشمنی رہتی تھی۔ انسانی خون پانی سے زیادہ سستا اور ارزاں تھا۔ اسی طرح کی ایک لڑائی ”حرب بسوس“ کے نام سے مشہور ہے جو تقریباً چالیس سال تک لڑی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ ایک قبیلے کی مرغی دوسرے قبیلے کے کھیت میں چلی گئی تھی۔ جہی تو ”مسدس“ میں حالی نے کہا تھا:

کہیں تھا مویٹی چرانے پہ جھگڑا  
کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا  
لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا  
کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا  
یونہیں روز ہوتی تھی تکرار ان میں  
یونہیں چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عرب معاشرہ جو بے حس اور ظالم تھا میرے پیارے آقا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل اور کردار سے تبدیل کر دیا۔ کیوں کہ آپ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق و کردار، معاملات،

معمولات، رویے، ترجیحات میں صلہ رحمی کرنے والے تھے۔ صلہ رحمی یہ نہیں ہوتی کہ آدمی اچھائی کا بدلہ اچھائی سے دے بلکہ آپ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو تم سے تعلق توڑے تم اس سے جوڑو، جو تم سے بُرا کرے تم اس سے اچھا کرو!“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدمت اور صلہ رحمی صرف یہ نہیں کہ جو اچھا ہو، اسی کے ساتھ اچھائی کی جائے بلکہ اس معاملے میں اچھے برے کی تفریق نہیں ہونی چاہیے۔ آپ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے ایسے معاشرے کو تبدیل کیا کہ ان میں رواداری اور بھائی چارگی کی فضا پیدا ہو گئی۔ انصار اور مہاجر ایک دوسرے کے لیے اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار رہنے لگے۔

افسوس! ہمارا معاشرہ بھی اس وقت اُن عرب قبیلوں کی طرح عدم برداشت میں کم نہیں ہے۔ پورے معاشرے میں بے یقینی پھیلتی جا رہی ہے۔ عدم برداشت کی یہ لہر پاکستان کو کئی برسوں سے اپنی پلیٹ میں لیے ہوئے ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ معاشرہ دیوانگی اور بربریت کے خلاف مزاحمت کی بجائے اس کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ جہاں بھی دیکھیں لوگ ایک دوسرے کے دست و گریباں ہیں۔ معمولی معمولی باتوں پر غلیظ زبان کا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے۔ بچے اساتذہ سے بدتمیزی کرتے نظر آتے ہیں، استاد بچوں سے انتہائی سفاکانہ اور سخت رویے سے پیش آتے ہیں۔ والدین اولاد کے ساتھ اور اولاد والدین کے ساتھ تمیز کے دائرے سے باہر نظر آتے ہیں۔ ٹریفک سگنل پر کھڑی گاڑیوں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ جلد سے جلد آگے نکل جائیں، چاہے وہ کسی بھی حادثے کا شکار ہو جائیں انھیں تو بس جلدی جانا ہے؟ معاشرے میں عدم برداشت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ کوئی ایک دوسرے کی بات سننے کو تیار نہیں ہے بلکہ اپنے موقف پر ڈٹا ہوا ہے، چاہے اُسے کتنے ہی غلط دلائل پیش کرنا ہوں فخر سے پیش کرے گا۔ عدم برداشت کے اس خوفناک رجحان سے معاشرے میں تشدد کے ایسے ایسے لرزہ خیز واقعات بھی جنم لے رہے ہیں کہ ان کا ذکر کرتے ہوئے انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں، بڑائی وہ ہے کہ لوگ اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی اصلاح کریں۔ مگر یہاں تو معاملہ بالکل برعکس ہے، غلطی تسلیم کرنے کے بجائے دوسرے کو غلط ثابت کرنے میں وقت صرف کر دیتے ہیں۔

بہترین معاشرے کی مثالیں ہمارے پیارے آقا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال قبل ہی پیش کر دی تھیں۔ آپ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جب ایک گلی سے تشریف لے جاتے تھے تو ایک عورت آپ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر کچرا پھینکا کرتی تھی۔ ایک دن اُس عورت نے کچرا نہیں پھینکا تو آپ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے

معلوم کیا، تو پتا چلا کہ وہ بیمار ہے۔ آپ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے گھر تشریف لے گئے اور عیادت کی۔ کیا ہمارے معاشرے میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی خطبات مدراس میں لکھتے ہیں کہ ایک انگریز مورخ لکھتا ہے ”میں نے مسلمانوں کے پیغمبر جیسی برداشت، صبر اور عقل کامل کہیں نہیں پائی“۔ ہمارے معاشرے میں عدم برداشت اسی وقت ختم ہو سکتا ہے، جب ہم اسوہ حسنہ پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر تسلیم و رضا اپنائیں۔

خواجہ حسن نظامی اردو کے مایہ ناز ادیب ہیں آپ کی بے شمار کتب ہیں۔ اُن ہی کتب میں ”عذر دہلی کے افسانے“ اور ”بیگمات کے آنسو“ بہت مشہور ہیں۔ جن میں 1857ء کے انقلاب کے نتیجے میں شہزادوں اور بیگمات کے مصائب کی داستانیں لکھی ہیں جنہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایک مغلیہ سلطنت کی تاریاجی اور بربادی کے خود بادشاہ اور شہزادے ذمے دار تھے۔ سلطنت کے ٹٹ جانے کے بعد وہ کس طرح در بدر کی زندگی گزار رہے تھے یہ کہانیاں اتنی پُر اثر اور دل گداز ہیں کہ بے اختیار ان شہزادوں اور خانوادوں کے حالات پڑھ کر افسوس ہوتا ہے۔ ”شہزادے کا بازار میں گھسٹنا“ اس واقعے میں ایک فقیر شہزادوں کو منع کرتا ہے کہ درختوں پر بیٹھے پرندوں کو تنگ مت کرو، لیکن شہزادے اپنی جاہ و حشمت کے غرور میں تھے اس لیے فقیر کو برا بھلا کہنے کے بعد غلیل سے اُس کے پیر پر ایک پتھر مارا جس سے وہ بے چارہ گھسٹتا ہوا جاتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ تخت کیوں کر آباد رہے گا جس کے وارث ایسے سفاک ظالم ہیں۔ جب انگریز فوجوں نے سلطنت پر قبضہ کر کے بادشاہ اور شہزادوں کو گرفتار کیا تو انہی میں شہزادہ نصیر الملک بھی تھا جس نے فقیر کو غلیل سے پتھر مارا تھا۔ جب انگریزوں سے آزادی ملی تو دہلی کے بازار میں ہاتھوں کو ٹیک کر کوٹھوں کو گھسیٹتے ہوئے راستہ چلتا تھا اور گلے میں ایک جھولی ہوتی تھی۔ آج بھی اہل ارباب اختیار اُن ہی بادشاہوں کی طرح کچھ برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اپنی خوشنودی کے حصول کے لیے مصر ہتے ہیں۔

غصہ ہمارے پورے معاشرے میں سرایت کر چکا ہے، جس کے اظہار کے لیے کبھی احتجاج اور کبھی تشدد کے واقعات رونما ہوتے ہیں، اسی وجہ سے جرائم کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے، فرقہ واریت بڑھ رہی ہے۔ عوام میں عدم تحفظ کا احساس شدت سے سرایت کر گیا ہے۔ روزانہ بریکنگ نیوز کی صورت میں پاکستان کے مختلف حصوں سے تشدد کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ یہی نہیں اگر ہم اپنے نجی معمولات پر بھی نظر ڈالیں تو ہمیں بہت سے لوگوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جہاں ہمیں اکثر اوقات عدم برداشت کے مظاہرے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ہمارے مذہبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی رویوں میں بے اعتدالی پیدا ہو گئی ہے۔ مذہبی طبقہ اپنے اپنے مسالک کو

درست قرار دینے کے لیے دوسرے مسالک کو نشانہ بناتے ہیں۔ اسی طرح سیاستدانوں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اپنی جماعتوں کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دوسروں کو گڑھے میں ڈالنے پر اصرار کرتے ہیں۔ ثقافتی اور سماجی حلقوں کا بھی یہی حال ہے کہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہر جگہ پیکٹ کی صورت میں لوگ جمع ہیں اور اپنے ہم نظریہ لوگوں کو ہی برداشت کرتے ہیں۔ کیا کسی بھی معاشرے میں تمام لوگ اتفاق کے بجائے نفاق سے رہیں، یہ ہمارے لیے کس حد تک قابل قبول ہوگا؟ ہم مسلمان تو ہیں، مگر جب کوئی سماجی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو رویوں میں تبدیلی ہونے لگتی ہے۔

عدم برداشت سے نفسیاتی مسائل جیسے خوف، غصہ، چڑچڑاپن اور ذہنی الجھنوں کا سامنا رہتا ہے۔ معاشرے میں بہت سی چیزیں مثبت کے بجائے منفی سطح پر تیزی سے گامزن ہو رہی ہیں جو کہ کسی بھی معاشرے کی بقا کے لیے تشویش کا باعث ہے۔ آپ اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تحمل، صبر اور قناعت ایسی چیزیں ہیں کہ اونٹ چرانے والی قوم کو اللہ تعالیٰ نے حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے صدقے میں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔



## باجوڑ مدرسے کے بچو تم بھی ہمیں یاد ہو!

جیسے آرمی پبلک اسکول پر امریکا کے پیدا کردہ طالبان نے حملہ کیا تھا اسی طرح باجوڑ کے دینی مدرسے پر امریکا نے بھی ظلم کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے ڈرون حملہ کیا تھا اور 80 سے زائد بے گناہ طلبا شہید کر کے اپنی سفاکیت کا فرعونى مظاہرہ کیا تھا۔ معلوم تاریخ میں ایسا تو کسی جابر حکومت نے اپنے غلاموں سے بھی ظلم نہیں کیا ہوگا جیسے امریکا نے کیا تھا۔ کمانڈو ڈکلیئر مشرف نے ایک فون پر سرنڈر ہو کر امریکا کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تھے اور پاکستانیوں پر ظلم کی کھلی چھٹی دے دی تھی۔ باجوڑ کے مدرسے پر امریکی ڈرون حملہ اُس وقت کی بات ہے جب امریکا ڈکلیئر مشرف سے پیشگی اجازت لیتا تھا اور پھر ڈرون حملہ کرتا تھا۔ اس کا مطلب ہوا کہ امریکا کے ساتھ ساتھ ڈکلیئر مشرف نے اس بین الاقوامی جرم میں مقامی سہولت کار کا کردار ادا کیا تھا۔ جب آرمی پبلک اسکول کے بچوں کے ساتھ طالبان کے ظلم کے خلاف پورے ملک میں پروگرام ہو رہے تھے۔ 16 دسمبر کو مظلوم بھولوں کے والدین اس پروگرام میں شریک ہو کر اپنے جذبات اور دکھوں کا اظہار کر رہے تھے تو باجوڑ کے دینی مدرسے میں ناحق قتل کئے گئے بچوں کے والدین کی آنکھیں بھی پُریم تھیں مگر ان کی پُریم آنکھیں پاکستان میں کسی کو نظر نہیں آ رہی تھیں کیونکہ وہ غریب ہیں۔ ان کی آنکھیں صرف اللہ کے حضور فریاد کناں تھیں کہ اے اللہ ہمارے بچوں کو کس گناہ کے بدلے امریکا نے سفاکیت سے شہید کیا تھا۔ اُن کی آنکھیں پاکستان کے عوام کی طرف دیکھ رہیں تھیں کہ ہمارے مظلوم بچوں کے لیے کوئی ترانہ گایا جائے گا کوئی دکھ کا اظہار کیا جائے گا۔ ان کو کیا معلوم کہ کچھ اپنوں نے اور کچھ غیروں نے مل کر پاکستان بلکہ دنیا کے دینی لوگوں کو بے توقیر کر دیا ہے پھر آپ کے بچوں کے لیے کون ترانے گائے اور کون دکھ کا اظہار کرے گا؟ ڈکلیئر مشرف نے تو قوم کی ہزاروں بیٹیوں کو اسلام آباد کے مدرسہ حصہ میں اپنے آقا امریکا کے کہنے پر فاسفورس بم مار کر شہید کر دیا تھا جو بعض لوگوں کے مطابق اسی ظلم کی وجہ سے خود کش بمبار پیدا ہوئے تھے۔ اس ظلم کی وجہ سے ڈکلیئر مشرف پر اب بھی مظلوم بچیوں کے انصاف کے حصول کے لئے مقدمہ چل رہا ہے۔ دینی مدرسوں کی مظلومیت کی تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو

مسلمان سوسائٹی میں مدرسہ ایک بنیادی اکائی ہوا کرتا تھا وہاں سے مسلمان بچے بچیاں دین کی تعلیم حاصل کر کے نکلتے تھے اور مسلمانوں کے معاشرے کے اندر ان کی قدر و منزلت بھی تھی۔ برصغیر پر انگریزوں نے قبضہ کیا مسلمانوں سے اقتدار چھیننا تھا لہذا انہوں نے مسلمانوں کو برباد کرنے اور دبا کر رکھنے کی پالیسی کے تحت مدرسے اور عام تعلیم میں تضاد پیدا کیا لارڈ مکالے نے ایسی تعلیمی پالیسیاں بنائیں کہ مسلمانوں کے اندر ملا اور مسٹر کی تقسیم پیدا ہو۔ مسٹر والی تعلیم سے نوکریاں ملنا شروع ہو گئیں تو مسلمانوں نے بھی دینی مدرسے کی طرف رجحان کم کر دیا اور اپنے بچوں کو انگریز کے نظام تعلیم میں داخل کیا بلا آخر نظام حکومت انگریز کی مرضی کے مطابق دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ انگریزی تعلیم والوں کو حکومت کی طرف سے مراعات بھی ملتی تھیں۔ دینی تعلیم کو اس وقت کے علما نے سنبھال لیا۔ دینی مدرسے میں غریب مسلمانوں کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ انگریز دینی مدرسوں کے بچوں کو بیچ کام والے درجے میں رکھا تھا یعنی موچی، ترکھان وغیرہ۔ ان کو نہ بس اور ریل کے کرایے میں رعایت ملے نہ ہی نوکری ملے۔ دینی مدرسے کے طالب علم کو انگریز حکومت سے کوئی بھی مدد نہیں ملتی تھی۔ غریب ترین مسلمانوں کے بچے مدرسے میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور باقی انگریزی اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ مدرسے کے بچے زکوٰۃ، خیرات اور صدقات کے حصول پر ہی پلتے اور پڑھتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی یہی نظام چل رہا ہے۔ باجوڑ مدرسے کے بچے بھی اسی طرح تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ ان بچوں نے نہ کوئی امریکا کے خلاف غیر قانونی حرکت کی تھی اور نہ ہی کسی قسم کی دہشت گردی کی تھی وہ بے بس بچے تھے وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ جو بچے محلے کے لوگوں سے، کہیں پوری روٹی اور کہیں سے آدمی روٹی اور سالن پر گزارا کرتے ہوں اس سے کسی غیر قانونی کام کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔ کیا یہ سب حالات امریکا کی نظروں سے اوجھل تھے نہیں جی، امریکا کو سیٹ لائٹ نظام سے زمین پر چلنے والے کیڑے مکوڑے بھی صاف صاف نظر آتے ہیں مدرسے میں پڑھنے والے طلباء نظر نہ آئیں ہونگے۔ اصل میں امریکا نے دینی حلقوں پر خوف کی فضا قائم کرنے تھی اور سزا دینی تھی جو اس نے دی۔ کیا قبائلی علاقوں میں آئے روز کے ڈرون حملوں سے بے گناہ بچے بوڑھے اور مسلمان خواتین ہلاک ہوتے رہے یہ تو آزاد دنیا بھی گائے بگائے کہتی رہتی ہے۔ کیا پاکستان کی امریکی غلام حکومتیں امریکا سے ان بے گناہوں کے لیے انصاف مانگ سکتیں ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ بات اخبارات میں آتی تھی کہ پیپلز پارٹی حکومت میں صدر زرداری صاحب نے امریکیوں کو کہا تھا کہ ڈرون حملوں سے میں تو کوئی بھی پریشان نہیں ہوتا آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ پیپلز پارٹی کے وزیراعظم کا بیان بھی اخبارات کی زینت بنا تھا کہ آپ ڈرون حملے

رہیں ہم پارلیمنٹ میں مصنوعی شور کرتے رہیں گے۔ جب حکمرانوں کے ایسے بیانات ریکارڈ پر ہوں تو پھر باجوڑ کے معصوم بچوں کے سفاکیت سے قتل عام پر کون گیت گائے گا اور کون دکھا کا اظہار کرے گا۔ ان بے گناہ بچوں کے والدین نے تو پہلے یہی صبر کر رکھا اور آئندہ بھی صبر ہی کرتے رہیں گے کہ ایک وقت آئے گا کہ ہر انسان کے ذرا برابر اچھے اور ذرا برابر برے کام کا حساب لیا جائے گا اور ظالم حکمرانوں کا کڑا امتحان لیا جائے گا اور اس وقت شاید؟ ان ظالموں سے یہ نہیں کہے گا کہ تم نے ان مظلوموں، بے گناہ، غریب اور نادار بچوں جو محلے کے گھر گھر سے روٹی اور سالن اکٹھا کر کے کھانے والے تھے، پر کیوں ظلم کیا تھا؟ بلکہ ان مظلوم بچوں سے پوچھے گا کہ تمہیں کیوں بے گناہ قتل کیا گیا تھا۔ کیا یہ ظالم اس سفاکیت کا جواب دینے کے قابل ہونگے؟ نہیں ہونگے بل لکل نہیں ہونگے۔ اس لئے ہم ان مظلوم بچوں کے والدین سے کہتے ہیں کہ وہ ایسا ہی صبر کریں جیسا وہ 2007 سے کرتے آئے ہیں اس غلامی کے دور میں ان کی کوئی بھی دادرسی نہیں کرے گا کیونکہ دنیا کا یہی چلن ازل سے چلا آ رہا ہے اسی لیے تو اللہ نے قیامت کا دن رکھا کہ جن کو دنیا کے جابر لوگ انصاف نہ دے سکیں ان کو قیامت کے دن انصاف مہیا کیا جائے اور ظالموں کو ان کے کیے کی سزا دی جائے گی۔ وہیں ان مظلوموں کے لیے ترانے پڑھے جائیں وہیں ان کے دکھوں کا مداوا ہوگا ان شاء اللہ۔



مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

تجوید کا سیکھنا ہر مسلمان پر واجب ہے،  
تجوید کی اسی اہمیت کے پیش نظر اس کتابچے  
میں ”تجوید تجوید“ کو نہایت ہی آسان الفاظ  
میں سمجھایا گیا ہے۔

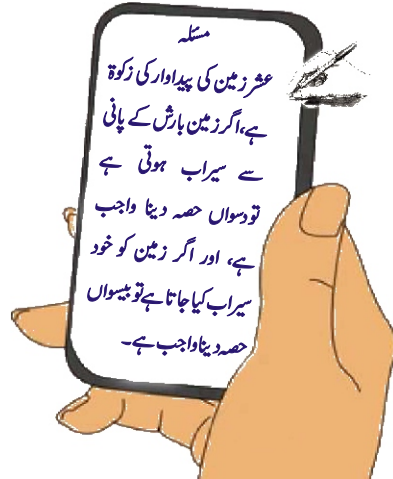
چونکہ موجودہ دور میں جدید تعلیم یافتہ لوگوں  
میں انگلش اصطلاحات کو سمجھنے والوں کی  
اکثریت ہے اسی لئے کتاب میں اردو کے  
ساتھ ساتھ انگلش الگورتھ میں اصطلاحات کو  
سمجھانے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

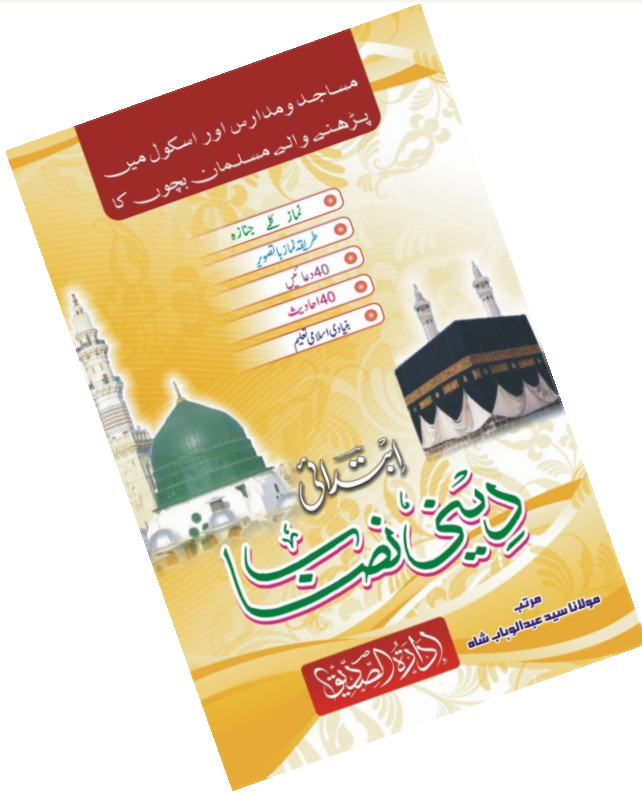


اپنے موبائل پر بالکل مفت دینی، فقہی مسائل  
حاصل کرنے کے لئے ابھی رائٹ میسج میں لکھیں:

**FOLLOW NUKTA313**

اور سینڈ کر دیں **9900** پر۔  
پھر **MUTE OFF** لکھیں اور **9900** پر  
سینڈ کر دیں۔ اگر نام پوچھا جائے تو اپنا نام لکھ کر  
**9900** پر سینڈ کر دیں۔ پہلی بار صرف **0.61** پیسہ  
چارجر ہیں، پھر ہمیشہ فری فقہی مسائل ملیں گے۔





مساجد و مدارس اور اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے لئے ایک خاص ترتیب پر تیار کیا جانے والا ایک بہترین دینی نصاب، جس میں ہر سبق کے ساتھ حاضری کی سہولت، طریقہ وضو اور نماز 4 کھڑتصاویر کی مدد سے سمجھایا گیا ہے۔ نماز، کلمے، جنازہ، چالیس دعائیں، چالیس احادیث اور دیگر بنیادی اسلامی معلومات، ایک سال کے لئے نمازوں کی حاضری کا کیلنڈر۔ رنگین صفحات، دیدہ زیب ٹائٹل۔ ملک بھر کے کئی دینی اداروں اور اسکولوں کے نصاب میں باقاعدہ شامل ایک بہترین کتاب۔

## شائع کر کے مفت تقسیم کریں آن لائن پڑھنے یا ڈاؤن لوڈ کرنے کے لئے

[www.urdubookdownload.wordpress.com](http://www.urdubookdownload.wordpress.com)

مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے  
”میں نے بصیرت کی بناء پر تجربہ کیا ہے کہ لوگوں  
کی دین سے دوری میں اسی 80 فیصد حرام مال  
کھانے کا عمل دخل ہے، اور دس فیصد اس سے کہ  
بے نمازی کے ہاتھ کا کھانا کھاتے ہیں اور دس  
فیصد اس سے کہ نیک لوگوں کی صحبت اختیار نہیں  
کرتے۔ حرام مال کھانے کے بے شمار ذرائع ہیں  
اور اللہ تعالیٰ کے بے شمار ایسے بندے ہیں جو ان  
ذرائع سے بچتے ہیں مگر شرعی تقسیم میراث ایک ایسا  
فریضہ ہے جس میں کوتاہی کے مرتکب بڑے  
بڑے دیندار لوگ بھی ہیں۔

تقسیم میراث کی اہمیت جاننے کے لئے چند  
صفحات پر مشتمل اس کتابچے کا خود بھی مطالعہ  
کریں اور زیادہ سے زیادہ شائع کر کے دوسروں  
تک پہنچائیں۔

من قطع میراث وارثه قطع الله میراثه من الجنة يوم القيامة  
جس نے کسی وارث کے حصہ میراث کو روکا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جنت سے اس کے حصے کو روکیں گے

## تقسیم میراث کی اہمیت و فضیلت

تحریر  
سید عبدالوہاب شاہ

